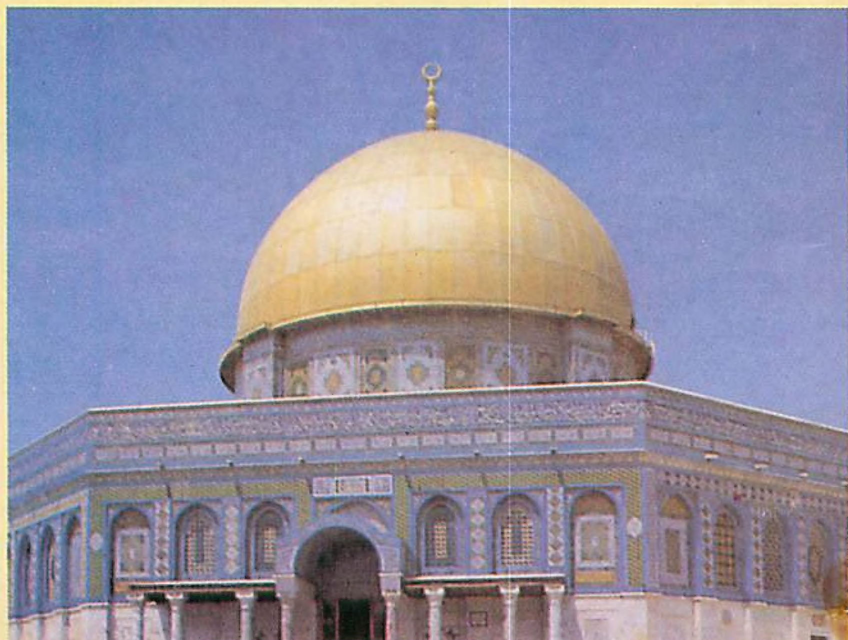
الرسالہ

Al-Risala

December 1994 • Issue 217 • Rs. 7

شیر سب سے زیادہ طاقت ور جانور ہے
مگر وہ کبھی کسی جانور سے نہیں لڑتا
شیر کا طریقہ اعراض ہے نہ کہ ٹکراؤ۔



The Dome of the Rock, Jerusalem

WOMAN BETWEEN ISLAM AND WESTERN SOCIETY

By Maulana Wahiduddin Khan

The status of woman in Islam is the same as that of man. Injunctions about honour and respect enjoined for one sex are enjoined equally for the other sex. So far as rights in this world and rewards in the Hereafter are concerned, there is no difference between the sexes. In the organization of daily living, both are equal participants and partners. Yet Islam sees man as man and woman as woman and, considering the natural differences, it advocates the principle of the division of labour between the two sexes rather than the equality of labour.

Price Rs. 85
ISBN 81-85063-75-3

AL-RISALA BOOKS
The Islamic Centre
(Publications Division)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110 002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

دسمبر ۱۹۹۴، شمارہ ۲۱۷

فہرست صفحہ

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single Copy Rs. 7 □ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)
Printed by Nice Printing Press, Delhi

ایک دُعا

یہ دنیا حادثات کی دنیا ہے۔ یہاں یکساں حالات کا برقرار رہنا ممکن نہیں۔ یہاں عین فطرت کے قانون اور عین تخلیقی نظام کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ بار بار حالات میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ بار بار نقصان سے سابقہ پیش آتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، یہ نقصان کبھی خوف کی صورت میں پیش آئے گا، کبھی بھوک کی صورت میں، اور کبھی مال اور جان اور فائدہ میں کمی کی صورت میں (البقرہ ۱۵۵)

ایسی حالت میں ایک انسان وہ ہے جو فریاد و ماتم کرنے لگتا ہے۔ وہ شکایت اور احتجاج کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ مایوسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ مگر یہ سچے انسانوں کا طریقہ نہیں۔ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جو سیدھے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

ایسے مواقع پر کسی انسان کے لیے صحیح اور سچا طریقہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ وہ سارے معاملہ کو مالکِ کائنات کے اوپر ڈال دے۔ وہ مصیبت کو صبر کا معاملہ بنائے نہ کہ بے صبری کا۔ وہ اس کو وقتی تاثر کے خانہ میں ڈالے نہ کہ مستقل تاثر کے خانہ میں۔

جن لوگوں کے اندر یہ ربانی شخصیت ہو۔ جو سچائی کے راستہ کو پائے ہوئے ہوں۔ ان پر جب ایسی کوئی آفت آتی ہے تو ان کی زبان سے نکل پڑتا ہے کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ خدایا، تو ہماری مصیبت میں ہم کو اجر دے۔ تو اس کے بعد ہمارے لیے خیر کی صورت پیدا فرما دے (اِنّا للّٰہ و اِنّا اِلیہ راجعون۔ اللّٰھم اَجِرنا فی مصیبتنا واخلف لنا خیرا منھا)

جو بندہ شخصی یا قومی مصیبت پیش آنے کے بعد یہ کہہ پڑے۔ اس کو فوراً ایک نیا سنبھالا مل جائے گا۔ جھٹکا لگنے کے بعد وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ ناامیدی کے تجربہ سے دوچار ہونے کے بعد وہ جلد ہی امید کا نیا تحفہ اپنے لیے پا لے گا۔

ایسے لوگ ماضی کو کھو کر دوبارہ اپنے مستقبل کو پا لیتے ہیں، وہ محرومی میں بھی یافت کا سرمایہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جہاں بظاہر کہانی ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہو وہاں بھی وہ ایک نیا پیراگراف معلوم کر لیتے ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنی زندگی کی کہانی کو ازسرنو شروع کر سکیں۔

جنت کے کنارے

عن ابی ھریرۃؓ قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: إذا مررتُم بریاضِ الجنۃِ فَارْتَعُوا۔ قیلَ یا رسولَ اللہ وما ریاضُ الجنۃِ۔ قال المساجد (وحِلَقُ الذکر) قیلَ وما الرتعُ یا رسول اللہ۔ قال: سبحانَ اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر۔

(مشکاۃ المصابیح ۱/۲۲۸ - ۲/۷۰۳)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو اس سے چر لیا کرو۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول، جنت کے باغ کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مسجدیں اور ذکر کے حلقے۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول، چرنا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: سبحان اللہ اور الحمد للہ اور لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر۔

آدمی جب دنیا میں چلتا پھرتا ہے تو اس کے سامنے ایسے مواقع آتے ہیں جو اس کے خدائی احساسات کو جگاتے ہیں۔ کبھی مسجد اس کو خدا کی معبودیت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کبھی ذکر خداوندی کی مجلسیں اس کو خدا کی صفات کی یاد دلاتی ہیں۔ کبھی کائنات کی نشانیاں اس کو خدا کے عظمت وجلال کی جھلک دکھاتی ہیں۔

اس قسم کے تجربات آدمی کو جنت کے باغوں میں سے کسی باغ کے کنارے پہنچا دیتے ہیں۔ وہ آدمی کے اندر ان احساسات کو پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں جو اس کو جنت میں پہنچانے والے ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ان مواقع سے استفادہ کرے اور ان سے جنتی غذا لے کر اپنے آپ کو جنت میں بسنے کے قابل بنالے۔

ان تجربات کے درمیان آدمی کے اوپر اتنا شدید تاثر طاری ہونا چاہیے کہ اس کی روح حقیقتِ اعلیٰ سے مربوط ہو جائے۔ اس کے ابلتے ہوئے احساسات ان الفاظ میں ڈھل جائیں کہ خدایا، تو پاک ہے۔ سارا شکر اور ساری تعریف تیرے لیے ہے۔ تو ہی معبود ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ ساری بڑائی صرف تیرے لیے ہے، تیرے سوا کسی کو بھی کوئی بڑائی حاصل نہیں۔

دنیا میں آدمی کو اس طرح رہنا ہے کہ وہ یہاں کے مناظر میں جنت کی جھلک دیکھنے لگے۔ اس کے بعد ہی وہ جنت کے باغوں میں چرنے کی سعادت حاصل کر سکتا ہے۔

نقطۂ انقلاب

عمر بن عبدالعزیز تابعی بنو امیہ کے ایک خلیفہ تھے۔ ان کے عالم اور زاہد اور خلیفۂ راشد ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ صحابہ کے بعد ان کا مقام امت میں سب سے زیادہ بلند مانا جاتا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنی ابتدائی زندگی میں ایک خوش باش اور خوش پوشں انسان کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ وہ پر تکلف زندگی گزارتے تھے۔ آخرِ عمر میں وہ بالکل بدل گیے۔ اس تبدیلی کے لیے جو واقعہ نقطۂ آغاز ثابت ہوا وہ یہ تھا:

قال عبد الله بن کثیر قلتُ لعمر بن عبد العزیز ما کان بدءُ انابتك. قال اردت ضرب غلام لی فقال لی اذکر لیلةً صبیحتها یوم القیامة (البدایة والنهایة ۹/۱۹۵)

عبداللہ بن کثیر کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز سے پوچھا کہ آپ کی انابت کا آغاز کیسے ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے ایک غلام کو مارنا چاہا تو اس نے کہا کہ اس رات کو یاد کرو جس کی صبح قیامت کا دن ہے

جب آدمی کے اندر زندگی ہو، جب آدمی کے اندر قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہو تو ایک جملہ اس کو بدلنے کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب اس کی روح مردہ ہو جائے۔ جب اس کی قبول کرنے کی صلاحیت زندہ حالت میں باقی نہ رہے تو ہر دلیل اس کے لیے بے کار ہے۔ اس کے بعد کسی بھی قیمت پر وہ حق کو قبول کرنے والا نہیں، خواہ حق کو کتنا ہی زیادہ دلائل کے ساتھ اس کے سامنے بیان کر دیا گیا ہو۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے غلام کو مارنا چاہتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلام سے ان کو کوئی سخت شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود غلام کی بات نے ان کو ہلا دیا۔ یہ کسی انسان کے لیے انتہائی عظمت کی بات ہے۔ ایک شخص جس سے تکلیف پہونچی ہو۔ جس نے سخت شکایت کا موقع دیا ہو، اس کی بات سے مثبت اثر لینے کے لیے بہت اونچی انسانیت درکار ہے۔ مگر اس دنیا میں وہی لوگ اونچی ایمانی ترقی کرتے ہیں جو اس قسم کی اونچی انسانیت کا ثبوت دے سکیں۔

مردہ انسان کے لیے شکایت کا واقعہ اختتام کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر زندہ انسان کے لیے شکایت کا واقعہ ایک نئے دور کا آغاز بن جاتا ہے۔

اختلاف کے باوجود

جس زمانے میں حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی، قیصر روم (قسطنطنیہ) نے ارادہ کیا کہ وہ مسلم دنیا پر حملہ کر دے۔ اس کے ذہن میں آیا کہ اِس وقت مسلمان باہمی لڑائی میں مبتلا ہیں۔ اگر اس وقت میں نے حملہ کر دیا تو میں شام ومصر وغیرہ علاقہ پر دوبارہ قبضہ کر سکتا ہوں۔ حضرت معاویہ کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً قیصر روم کے نام ایک خط روانہ کیا، اس میں لکھا ہوا تھا:

اذا عقدت العزم على ان تحقق ارادتك فانى أقسم ان اتصالح مع صاحبى ثم لاسيّرن ضدك جيشاً سأكون ضمن اول كتيبة فيه وسأجعلن من القسطنطينية شعلة نار (تاج العروس ٧/ ٢٠٨)

اگر تم نے یہ عزم کیا کہ تم اپنے ارادہ کو پورا کرو تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں علی سے صلح کر لوں گا۔ پھر میں تمہارے خلاف ایک لشکر روانہ کروں گا جس کے پہلے دستہ میں میں خود شامل ہوں گا اور پھر میں قسطنطنیہ کو آگ بنا دوں گا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت معاویہ کے اس خط کے بعد قیصر روم نے اپنا حوصلہ کھو دیا۔ اس نے فوجوں کی تیاری روک دی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب مسلمانوں سے جنگ چھیڑنا اپنی مزید بربادی کو دعوت دینا ہے۔

یہ زندہ لوگوں کا طریقہ ہے۔ ان کے اندر آپس میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ مگر جب معاملہ وسیع تر مفاد کا آجائے تو وہ اپنے اختلاف کو ختم کر کے ایک ہو جاتے ہیں۔ ان کے اختلاف کی ایک حد ہوتی ہے۔ حد کے آجانے کے بعد ان کا اختلاف باقی نہیں رہتا۔

زندہ انسان دوستی کے باوجود کسی کی بے جا حمایت نہیں کرتا۔ وہ دشمنی کے باوجود کوئی چھوٹی حرکت نہیں کرتا۔ وہ انفرادی جھگڑے کے باوجود اجتماعی امور میں متحد ہو جاتا ہے۔ وہ شخصی کدورت کے باوجود اسلامی تعلق میں فرق نہیں آنے دیتا۔ زندہ انسان کسی سے نزاع پیش آنے کے باوجود اس کی خصوصیات کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ رنجش پیدا ہونے کے باوجود امانتوں کو ادا کرتا ہے۔ زندہ انسان کسی حال میں پست حرکت نہیں کرتا، وہ کسی حال میں اپنی انسانیت کو نہیں کھوتا۔ زندہ انسان دشمن ہو سکتا ہے مگر وہ کمینہ نہیں ہو سکتا۔ زندہ انسان شاکی ہو سکتا ہے مگر یہ ممکن نہیں کہ جس سے اس کو شکایت ہو اس کے خلاف وہ جھوٹا الزام لگانے لگے۔

تنقید کو سن کر

خلیفہ ہارون الرشید (۱۹۳ - ۱۷۰ھ) نے ایک بار اپنے وزیر سے کہا کہ مجھ کو کسی بزرگ کے پاس لے چلو۔ وہ خلیفہ کو الفُضیل بن عیاض (۱۸۷-۱۰۵ھ) کے پاس لے گیا۔ اس سلسلہ میں لمبا قصّہ کتابوں میں نقل ہوا ہے۔

خلیفہ کے ساتھ اس کے کئی درباری تھے۔ انھوں نے فضیل سے مصافحہ کیا۔ خلیفہ نے بھی مصافحہ کیا۔ خلیفہ نے اپنا ہاتھ جب فضیل کے ہاتھ میں رکھا تو انھوں نے کہا کہ کتنا زیادہ نرم ہے یہ ہاتھ، اگر کل کے دن وہ اللہ کے عذاب سے بھی بچ جائے (یالہا مِن کف ما الینہا، اِن نجت غداً من عَذابِ اللہ عزّوجل)

اس کے بعد خلیفہ نے فُضیل سے کہا کہ کچھ نصیحت کیجئے۔ انھوں نے تلخ نصیحت کے انداز میں کچھ کلمات کہے۔ خلیفہ نے کہا کہ اور کچھ فرمائیے۔ فضیل نے مزید کچھ کہا۔ اس طرح وہ سخت تنقیدی انداز میں دیر تک خلیفہ کو ڈرانے والی باتیں کرتے رہے۔ خلیفہ ان کی نصیحتوں کو سن کر رو پڑا۔ آخر میں اس نے اپنے وزیر سے کہا کہ جب تم مجھ کو کسی آدمی کے پاس لے جاؤ تو اسی طرح کے آدمی کے پاس لے چلو۔ یہ مسلمانوں کے سردار ہیں (اذا دللتنی علی رجل فدلنی علی مثل ھذا، ھذا سیّدُ المسلمین)

آدمی کے اندر اگر صحیح مزاج ہو تو وہ نصیحت کو سن کر اس سے سبق لے گا، خواہ یہ نصیحت کتنے ہی سخت تنقیدی الفاظ میں کی گئی ہو۔ ایسا آدمی نصیحت کو اس کے معنوی اعتبار سے دیکھے گا نہ کہ اس کے لفظی اعتبار سے، وہ اس کو اصولی حیثیت سے لے گا نہ کہ ذاتی حیثیت سے۔

صحیح مزاج اگر بادشاہ کے اندر ہو تو وہ بھی تنقید کو سن کر اسے برداشت کرے گا۔ اور ایک معمولی آدمی بھی اگر صحیح مزاج نہ رکھتا ہو تو وہ تنقید کو سن کر بگڑ جائے گا۔ تنقید کسی آدمی کو پہچاننے کی سب سے زیادہ یقینی کسوٹی ہے۔ تنقید کو سن کر جو آدمی اپنے ذہنی توازن کو نہ کھوئے وہی اعلیٰ انسان ہے۔ اور جو شخص تنقید کو سن کر بگڑ جائے، اس کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اپنے اندر اعلیٰ انسان والی خصوصیات رکھتا ہے۔

تنقید کسی آدمی کی انسانیت اور اس کے تقوی کی پہچان کراتی ہے۔

مومنانہ طریقہ

مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۷) کی آخر زندگی میں یہ حادثہ پیش آیا کہ گھر میں بھری ہوئی بندوق چل گئی جس کی وجہ سے ان کا ایک پاؤں شدید طور پر زخمی ہوا اور بالآخر اس کو ڈاکٹروں نے کاٹ دیا۔ اس حادثہ پر شاعروں نے طرح طرح کے مضامین باندھے۔ کسی نے کہا "ہمت کا قدم زمیں پہ گاڑ دیا" کسی نے لکھا "سیرت نگار نبوی نے حوروں کی پا بوسی کے لیے پہلے ہی سے قدم بھیج دیا" وغیرہ۔ مگر خود مولانا شبلی کے جذبات دوسرے تھے۔ انھوں نے اپنے اس حادثہ پر یہ شعر کہا:

شبلیؔ نامہ سیہ را بجزا ے عملش　　پا بریدند وصدا خاست کہ سر می باید

یعنی شبلی کے سیاہ اعمال کی وجہ سے اس کا پاؤں کاٹ دیا گیا تو اوپر سے آواز آئی کہ پاؤں نہیں سر کی ضرورت ہے۔

یہی مومن کا طریقہ ہے۔ مومن کبھی دوسروں کی تعریف سے غلط فہمی میں نہیں پڑتا عین اس وقت جب کہ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، اس کی اندرونی نفسیات اس کو اپنی بے حقیقتی یاد دلاتی ہے۔ جب اس کے نام پر استقبالیہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ برعکس طور پر اپنے ذاتی احتساب میں مشغول ہو جاتا ہے۔

دوسروں کی تعریف سے اپنی شخصیت کے قد کو ناپنا انتہائی سطحیت کی بات ہے، اور مومن سب سے زیادہ اس سطحیت سے دور ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کی نسبت سے جانچے نہ کہ انسان کی نسبت سے۔ اور جو شخص اپنے آپ کو خدا کی نسبت سے جانچے وہ کبھی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو سکتا۔

تعریف مومن کی تواضع کو بڑھاتی ہے، اور جو غیر مومن ہو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ تعریف سے صرف اس کے جھوٹے پندار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اپنے کو قابل تعریف سمجھنا، اپنے آپ کو خدا کا ہمسر بنانا ہے۔ اور خدا کا ہمسر بننا، بلاشبہ کسی انسان کا سب سے بڑا جرم ہے۔

مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہر موقع پر خدا یاد آتا ہے۔ مذمت کا پہلو ہو یا تعریف کا، ہمیشہ وہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جب کوئی شخص اس کی تعریف کرتا ہے تو وہ عین اپنے مزاج کی بنا پر خدا کو یاد کرنے لگتا ہے جو تمام بڑوں سے زیادہ بڑا ہے۔ خدا کی عظمت کا احساس اس سے ذاتی عظمت کے احساس کو چھین لیتا ہے۔ تعریف اس کی تواضع کو بڑھانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

ماضی اور حال

مسیح الملک حکیم اجمل خاں (۱۹۳۰ - ۱۸۶۴) کو طب اور علاج میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ لارڈ ہارڈنگ ۱۹۱۰ سے ۱۹۱۶ تک ہندستان کے وائسرائے تھے۔ حکیم اجمل خاں کی شہرت سے متاثر ہو کر وائسرائے نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو ان کے پاس طبی مشورہ کے لیے بھیجا۔ وہ دہلی میں ان کے مطب میں آئے تو دیکھا کہ وسیع مطب آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ سکریٹری پر اس کا بہت اثر ہوا۔ واپس جاکر اس نے وائسرائے سے اس کا ذکر کیا۔ وائسرائے نے کہا کہ وہ ہندستان کے مقناطیس ہیں:

He is the magnet of India.

حکیم اجمل خاں کی اسی عظمت و مقبولیت کا یہ نتیجہ تھا کہ جب وہ قومی سیاست میں داخل ہوئے تو اس کے اندر انھوں نے مرکزی مقام حاصل کر لیا۔ دہلی میں ان کے مکان (شریف منزل) میں وقت کی بڑی بڑی شخصیتیں جمع ہوتی تھیں۔ مثلاً پنڈت موتی لال نہرو، بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے، سی آر داس، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی، ڈاکٹر محمد اقبال، وغیرہ۔ حکیم صاحب نے مسلم ملکوں کے علاوہ انگلینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریلیا وغیرہ کے سفر بھی کیے۔

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب کہ جدید میڈیکل سائنس ابھی اپنے عروج کو نہیں پہونچی تھی۔ اس زمانہ میں ابھی طب کی اہمیت پوری طرح باقی تھی۔ اس وقت مسلمان فن طب کے امام تھے۔ آج ان کی یہ حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ روایتی طب کے زمانہ میں وہ دنیا سے آگے تھے، سائنسی طب کے زمانہ میں وہ دنیا سے پیچھے ہو گیے۔

سائنس اور سائنسی طب میں مسلمانوں کی اس پسماندگی کی ذمہ داری تمام تر مسلم رہنماؤں پر ہے۔ علماء نے مذہبی بنیاد پر اور لیڈروں نے سیاسی بنیاد پر اور کچھ "مفکرین" نے نظریاتی بنیاد پر مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تعلیم میں کم از کم ایک سو سال دنیا سے پیچھے ہو گیے۔

علم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے بعد مشرک قیدیوں کے ذریعہ مسلمان بچوں کو تعلیم دلائی۔ حقیقت یہ ہے کہ علم ہر حال میں مطلوب ہے۔ کسی بھی عذر کی بنا پر علم سے روکنا ہرگز جائز نہیں۔

لکھنؤ کا سفر

لکھنؤ میں اسٹوڈنٹس اسلامک ویلفیر سوسائٹی (الجمعیۃ الخیریہ لمساعدۃ الطلاب) کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے، اس کے صدر مولانا ظہیر احمد صدیقی ندوی ہیں۔ مولانا طارق انور خاں ندوی اس کے سکریٹری جنرل ہیں اور مولانا زبیر ملک فلاحی اس کے آرگنائزر ہیں۔ اس ادارہ نے ۲۹ فروری۔ یکم مارچ ۱۹۹۲ کو لکھنؤ میں ایک علمی سیمینار کیا۔ اس کا عنوان تھا: "مدارس اسلامیہ ہند کا ماضی، اور مستقبل کے امکانات ——— فراہمی قیادت کے پس منظر میں"۔ اس کی دعوت پر لکھنؤ کا سفر ہوا۔

۲۸ فروری کو روانگی سے کچھ پہلے ایک مسلم صحافی میرے پاس آئے۔ وہ دہلی میں اوکھلا کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ وہ مسلم مسائل پر مجھ سے انٹرویو لینا چاہتے تھے۔ میں نے کہا کہ اس وقت تو میں سفر پر جا رہا ہوں، اس لیے کوئی مفصل انٹرویو نہیں دے سکتا۔ انھوں نے مختصر پیغام پوچھا۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل صبر و اعراض ہے۔

انھوں نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر کی بات کرتے ہیں۔ آخر صبر کب تک کیا جائے۔ میں نے کہا کہ ابھی تو آپ حضرات نے صبر کا آغاز بھی نہیں کیا۔ پھر اس کی حد کا کیا سوال ہے۔ مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ پرسوں سے جامعہ ملیہ میں ہڑتال چل رہی ہے۔ تمام دفاتر بند ہیں۔ طلبہ تعلیم کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ طلبہ کی یونین کے ایک صاحب وائس چانسلر آفس میں گئے۔ وہاں انھوں نے اپنا خط ٹائپ کرانا چاہا۔ ٹائپسٹ نے کہا کہ ہمارا ٹائپ رائٹر خراب ہے۔ اس پر ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ یہاں تک کہ چار آدمی زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گئے اور جامعہ غیر معینہ مدت تک کے لیے بند ہو گئی (قومی آواز ۲۶ فروری ۱۹۹۲)

کیا یہی صبر ہے۔ صبر یہ تھا کہ ٹائپسٹ نے جب عذر کیا تو آپ اپنا خط لے کر بازار چلے جاتے اور وہاں ٹائپ کرا لیتے۔ ایک روپیہ کے کام کے لیے آپ حضرات لڑ گئے اور ملی ادارہ کو اتنا بڑا نقصان پہنچایا جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ معمولی معمولی باتوں میں لڑ جائیں ان کا یہ کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ صبر کب تک کیا جائے۔ اور صبر کی حد کب آئے گی۔ جواب یہ ہے

کہ صبر شروع کرنے کے بعد صبر کی حد آتی ہے۔ جب صبر شروع ہی نہ کیا جائے تو اس کی حد کیسے آجائے گی۔
انھوں نے کہا کہ یہ تو چند لڑکوں کی بات تھی، وہ تمام لوگوں کی بات نہیں۔ میں نے کہا کہ شریعت کے اصول کے مطابق، وہ تمام لوگوں کی بات ہے۔ کیوں کہ دوسرے لوگوں نے اس کی مذمت نہیں کی۔ تمام لکھنے اور بولنے لوگ اس بارہ میں خاموش ہیں۔ اس طرح خاموش رہ کر وہ بالواسطہ طور پر ان بے صبر نوجوانوں کی حمایت کر رہے ہیں۔

۲۸ فروری کو ڈھائی بجے سہ پہر کا وقت ہے۔ میں پالم ایرپورٹ کی انتظار گاہ میں ایک سیٹ پر بیٹھا ہوں۔ چند آدمی سامنے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بے فکری کے ساتھ سگریٹ کے دھوئیں اڑا رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ لوگ اتنے بے فکر کیوں ہیں۔ میرے دل نے کہا کہ ان کی بے فکری کی وجہ یہ ہے کہ انھیں حال کی خبر ہے، مگر انھیں مستقبل کی کوئی خبر نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگلے لمحہ وہ جس جہاز پر بیٹھنے والے ہیں وہ ان کو لے کر ان کی مطلوب منزل کی طرف پرواز کرنے والا ہے۔ اگر وہ جانیں کہ ان کا سفر انسانی منزل کی طرف نہیں بلکہ خدائی منزل کی طرف ہے۔ یہاں کا ہر سفر آخر کار آخرت کا سفر ہے۔ ہر سفر اپنے خاتمہ پر وہاں پہنچنے والا ہے جہاں آدمی کو خدا کے سامنے جواب دہی کے لیے کھڑا ہونا ہوگا۔ اگر ان کو اس کا احساس ہو تو سگریٹ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جائے اور ان کو محسوس ہو کہ آنے والا جہاز انڈین ایرلائنز کا جہاز نہیں ہے بلکہ خدائی ایرلائنز کا جہاز ہے۔ اس کو کوئی انڈین پائلٹ نہیں چلا رہا ہوگا، بلکہ وہ خدا کا جہاز ہے جس کے پائلٹ فرشتے ہوں گے اور وہ اس کو دنیا سے اٹھا کر آخرت میں پہنچا دے گا۔ اگر لوگوں کو اس حقیقتِ کبریٰ کا احساس ہو تو ان کی زندگی کچھ سے کچھ ہو جائے۔

جہاز میں میری سیٹ کے قریب بہار گورنمنٹ کے دو افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: "لگتا ہے کہ گورنر (بہار) بھی اسی سے جانے والے ہیں۔ کوئی جانے والا ہے ضرور۔ اسی لیے آگے کی تین سیٹ خالی کی ہوئی ہے۔" میں نے سوچا کہ موجودہ دنیا میں کسی کو آگے کی سیٹ اس لیے ملتی ہے کہ وہ "گورنر" ہے۔ آخرت میں آگے کی سیٹ اس شخص کو ملے گی جو اللہ کی خاطر دنیا میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے راضی ہو گیا۔

یہ جہاز (نمبر ۴۰۹) لکھنؤ، پٹنہ ہوتا ہوا کلکتہ جا رہا ہے۔ جہاز دہلی سے روانہ ہوا تو اعلانات

شروع ہوئے۔ اس میں سے ایک اعلان یہ تھا کہ داخلی پروازوں میں سگریٹ پینا منع ہے :

smoking is prohibited on domestic flights

یہ بظاہر ایک چھوٹی بات ہے۔ مگر یہ چھوٹی بات ایک بڑی بات کی علامت ہے۔ یہ دراصل ہندستانی تہذیب پر مغربی تہذیب کی برتری کا اعلان ہے۔ ہندستان داخلی پروازوں میں اپنی تہذیب کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر بین اقوامی پروازوں میں بیرونی مسافروں کے دباؤ کی وجہ سے ہندستان کے لیے ممکن نہیں رہتا کہ وہ اپنی تہذیبی قدروں کو برقرار رکھ سکے۔

اس دنیا کی ایک سنگین حقیقت یہ ہے کہ یہاں کسی اقدام کا نتیجہ اقدام کرنے والے کی نیت کے اعتبار سے نہیں نکلتا بلکہ خارجی حالات کے اعتبار سے نکلتا ہے۔ اس کی ایک عبرت انگیز مثال انڈین ایرلائنز کا معاملہ ہے۔

۱۹۹۰ میں انڈین ایرلائنز کو ۴۶ کروڑ روپیہ کا گھاٹا ہوا تھا۔ اس گھاٹے کو ختم کرنے کے لیے جہاز کے کرایہ میں اضافہ شروع کیا گیا۔ حتی کہ مجموعی طور پر ۲۱۰ فی صد تک کرایہ کی شرح میں اضافہ کر دیا گیا۔ لیکن یہ اقدام الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا (Counter-productive) ثابت ہوا۔ ۹۲-۱۹۹۱ کے مالی سال میں ایرلائنز کا گھاٹا مزید بڑھ کر ۲۰۰ کروڑ روپیہ تک پہنچ گیا (ٹائمس آف انڈیا ۲۲ مارچ ۱۹۹۲)

اس الٹے نتیجہ کا سبب کیا تھا۔ اس کا سادہ سا سبب یہ تھا کہ کرایہ میں غیر معمولی اضافہ کے بعد ہوائی مسافروں کی تعداد کم ہو گئی۔

دہلی سے جہاز ساڑھے تین بجے روانہ ہوا۔ اور ٹھیک ۴۵ منٹ بعد وہ لکھنؤ کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ اس وقت میری عجیب کیفیت ہوئی۔ میں نے سوچا کہ ۴۵ منٹ کا یہ سفر طے کرنے کے لیے جو بے شمار اسباب درکار ہیں ان کے مہیا ہونے میں ۴۵ بلین سال سے بھی زیادہ وقت لگا ہے۔ اس سلسلہ کی مختلف کائناتی معلومات میرے ذہن میں ایک چلتی ہوئی ریل کی طرح گھومنے لگیں۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا : اس حیرت انگیز کائنات کا ایک خدا ماننا محض بے عقلی کا عقیدہ نہیں۔ یہ ناقابل فہم کے مقابلہ میں قابل فہم کا انتخاب کرنا ہے۔ یہ سب سے زیادہ منطقی تصور ہے جو کوئی صاحب علم آدمی اس دنیا میں اختیار کر سکتا ہے۔

ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہو کر ہوٹل گلمرگ پہنچا۔ میرا قیام ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۰۱ میں تھا۔ شام

کو میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ پڑھ رہا تھا کہ اچانک اللہ اکبر، اللہ اکبر کی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ لاؤڈ اسپیکر پر مختلف مسجدوں سے مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ دہلی سے روانہ ہونے کے وقت ایک صاحب نے کہا تھا کہ آپ لکھنؤ جا رہے ہیں، وہاں تو آج کل بی جے پی (کٹر ہندوؤں) کی حکومت ہے۔ فضا میں اذان کے الفاظ گونج رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ لوگ کتنا کم باتوں کو جانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر حکومت کی ایک حد ہوتی ہے۔ اپنی حد پر پہنچ کر ہر حکومت غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔ اور جہاں کسی حکومت کی حد ختم ہوتی ہے، اس کے بعد اتنی ہی وسیع دنیا باقی رہتی ہے جتنا لکھنؤ کے گورنمنٹ ہاؤس کے مقابلہ میں آفاق کی وسعتیں۔

۲۹ فروری کو فجر کی نماز لکھنؤ کی "مسجد نوازی" میں پڑھی۔ یہ مسجد مولانا محمد علی لین میں واقع ہے۔ ایک تنگ اور ناہموار گلی سے گزرتے ہوئے ہم مسجد کے دروازے پر پہنچے۔ چھوٹی مسجد میں تقریباً ڈیڑھ صف کی جماعت تھی۔ اس "لین" کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ انڈیا کی بہت سی سڑکوں پر آج بھی مولانا محمد علی کے نام کا بورڈ لگا ہے۔ تاہم ان سڑکوں کی سرگرمیوں پر ان کی کوئی چھاپ نہیں۔

ہوٹل گلمرگ کے اوپر وسیع چھت ہے۔ اس پر گھاس اگائی ہوئی ہے اور چاروں طرف گملے رکھے ہوئے ہیں۔ اس طرح یہاں مصنوعی طور پر قدرت کا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ اس چھت پر شامیانہ کے اندر سیمینار کی کارروائیاں ہوئیں۔ ۲۹ فروری کو صبح و شام دو اجلاس ہوئے۔ اور یکم مارچ کو صبح اور شام دو اجلاس۔ زیر بحث موضوع پر شرکا نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس کے بعد ہر مقالہ پر سوال و جواب ہوا۔ منتظمین کی خوش سلیقگی ہر جزء سے نمایاں تھی۔

مولانا محمد فاروق سلطان پوری بھی اس سیمنار میں شریک تھے۔ وہ ایک روحانی مزاج کے آدمی ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سننا بہت روحانی سکون کا باعث ہوتا ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے :

گلوں میں بو نہ ملی سنگ میں شرر نہ ملا مرا مذاق جدا تھا کہ ہم سفر نہ ملا

ایک گفتگو کے درمیان مولانا فاروق صاحب نے کہا کہ ایک بھکاری بھیک مانگ رہا تھا۔ اس نے ایک راہ گیر سے سوال کیا۔ اتفاق سے اس راہ گیر کی جیب میں اس وقت پیسے موجود نہ تھے۔ اس کو بھکاری پر ترس آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر بھکاری کو اپنے سینہ سے لگا لیا۔ بھکاری اس سے اتنا

زیادہ متاثر ہوا کہ اس کی زبان سے نکلا: بھگوان جتنا تو نے آج دلایا اتنا تو کبھی نہیں دلایا تھا۔

آدمی کے پاس اگر دوسروں کے لیے کوئی مادی چیز نہ ہو۔ مگر اس کے دل میں دوسروں کے لیے سچی محبت ہو، تو اس کی یہ محبت یقیناً فاتح عالم بن جائے گی۔

مولانا فاروق صاحب ہندی میں ایم اے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار وہ لکھنؤ کے علاقہ میں بس سے سفر کر رہے تھے۔ بس میں ایک ہندو سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران دونوں کو ایک دوسرے سے دل چسپی ہوگئی۔ مولانا فاروق صاحب نے اس ہندو بھائی کا پتہ لکھ لیا اور کہا کہ میں کبھی آپ کے پاس آؤں گا۔

اس کے بعد ایک سفر کے دوران مولانا فاروق صاحب اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ مذکورہ ہندو کے گاؤں میں گئے۔ رات ہو چکی تھی۔ پوچھتے ہوئے ہندو کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ ہندو بھائی گھر پر موجود نہیں ہیں۔ وہ کہیں چلے گئے ہیں۔ کچھ دیر کی حیص بیص کے بعد ایک اور ہندو نے آکر ان سے ملاقات کی۔ انھوں نے کہا کہ اب رات ہوگئی ہے اس لیے آپ یہیں ٹھہریے۔ انھوں نے پوچھا کہ کوئی مسلمان یا کوئی مسجد یہاں ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں نہ کوئی مسلمان ہے اور نہ کوئی مسجد۔ ہندو نے گھر کے ایک حصہ میں سب لوگوں کو ٹھہرایا۔ انھیں کھانا کھلایا۔ اس کے بعد وہ لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر سو گئے۔

صبح کو نماز فجر کے بعد وہ ہندو دوبارہ آیا۔ اس نے مولانا فاروق اور ان کے ساتھیوں کو دیہات کے طریقہ پر ناشتہ کرایا۔ جب وہ لوگ ناشتہ کر رہے تھے تو ہندو نے ہنستے ہوئے بتایا کہ میرا اس خاندان سے تعلق نہیں ہے۔ البتہ میں ان کا پڑوسی ہوں۔ رات کو جب آپ لوگ یہاں آئے تو گھر کی عورتوں نے مجھ کو بلایا اور کہا کہ کچھ مسلمان آئے ہیں۔ رات کی وجہ سے ان کو لوٹایا بھی نہیں جا سکتا۔ ہم ان کو جانتے بھی نہیں کہ وہ کون ہیں، ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔ مذکورہ ہندو نے گھر کی عورتوں سے کہا کہ ان لوگوں کو کھانا کھلا کر یہاں سلا دو۔ کیوں کہ یہ ہمارا انسانی فریضہ بنتا ہے۔ البتہ جہاں تک ان کی طرف سے ڈر کا سوال ہے تو میں آج کی رات نہیں سوؤں گا۔ رات بھر پہرہ دوں گا۔ چنانچہ آج میں رات بھر لاٹھی لے کر پہرہ دیتا رہا ہوں۔

ان لوگوں نے ایک طرف نو وارد مسلمانوں کے ساتھ انسانی فرض ادا کیا۔ دوسری

طرف ان کے امکانی خطرہ سے بچنے کے لیے رات بھر لاٹھی لے کر پہرہ دیتے رہے۔

۱۹۴۷ کے بعد پہلی اہم ترین مسلم کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ تقسیم کے بعد جو نئے حالات پیدا ہوئے اس میں مخصوص اسباب کے تحت ہندستان کے تمام مسلمان مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف دیکھنے لگے۔ فطری طور پر وہ مسلمانوں کے واحد قابل اعتماد لیڈر بن گئے۔ خود ان کے اپنے الفاظ میں "ملک کے مختلف گوشوں سے خطوں اور تاروں کی مجھ پر بارش ہونے لگی۔ ہر طرف سے تقاضا ہونے لگا کہ موجودہ حالت میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنا چاہیے"۔

چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی دعوت پر دسمبر ۱۹۴۷ کے آخر میں لکھنؤ میں مسلم کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں مولانا آزاد نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ ہمیں یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کو کون سا رخ اختیار کرنا ہے، آج ہمارے لیے صحیح راستہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا :

"مسلمانوں کے موجودہ حالات اور ملک کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ کوئی ضروری چیز نہیں ہو سکتی کہ جہاں تک ملک کی سیاسی زندگی کا تعلق ہے، فرقہ پرستی کو جو مذہب کے نام سے ابھاری گئی ہے، ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے۔ کسی ایک گوشہ کی فرقہ پرستی نہیں، کسی ایک جماعت کی فرقہ پرستی نہیں، سب کی فرقہ پرستی۔ (الجمعیۃ ویکلی ۲۴ مارچ ۱۹۷۳)

مولانا ابوالکلام آزاد نے مزید کہا کہ ہمیں فرقہ پرستی کے دروازہ کو بند کرنا پڑے گا، ورنہ ہماری موجودہ مشکلات ہرگز ختم ہونے والی نہیں۔ فرقہ پرستی کا خاتمہ کیے بغیر مسلمانوں کی فلاح کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں یہ سب سے زیادہ اہم بات تھی جو ۴۵ سال پہلے لکھنؤ میں کہی گئی۔ مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ یہ مقصد ایک فی صد کے بقدر بھی حاصل نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے مسلسل عمل کی ضرورت تھی۔ مولانا آزاد نے یہ کہا مگر کسی نامعلوم سبب سے انھوں نے اس کے لیے عملی جدوجہد نہیں کی۔ آزادی کے بعد مولانا آزاد گیارہ سال تک زندہ رہے۔ وہ اگر وزیر تعلیم بننے کے بجائے یہ کرتے کہ اخبار الہلال کو دوبارہ جاری کرتے اور اس کے ذریعہ یہ کوشش کرتے کہ لوگوں میں غیر فرقہ وارانہ سوچ پیدا کریں تو یقینی ہے کہ گیارہ سال میں وہ ایک

ذہنی انقلاب پیدا کر دیتے۔ مگر انھوں نے لوگوں میں ذہنی تبدیلی لانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ ۱۹۴۷ کے بعد کے حالات نے مولانا آزاد کو اجارہ داری کی حد تک بہترین مواقع کار دے دیے تھے۔ مگر وہ ان کو استعمال نہ کر سکے اور لوگوں کی بگڑی ہوئی سوچ بدستور اسی طرح بگڑی ہوئی حالت میں پڑی رہی۔

جس "ندوہ علیہ" میں شرکت کے لیے میرا لکھنؤ کا سفر ہوا تھا، وہ ۲۹ فروری۔ یکم مارچ ۱۹۹۲ کو ہوئی۔ اس کا مرکزی موضوع تھا: مدارس اسلامیہ ہند کا ماضی، اور مستقبل کے امکانات، فراہمی قیادت کے پس منظر میں۔ علماء اور اساتذہ اور دانشوروں نے اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کیے۔ شرکاء زیادہ تر اس مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے کو "انقلابی اسلام" کا علم بردار سمجھتا ہے۔ چنانچہ لوگوں کے اظہار خیال پر زیادہ تر یہی نقطۂ نظر چھایا رہا۔ اصولی نقطۂ نظر کی ترجمانی کم ہوئی اور گروہی نقطۂ نظر کی ترجمانی زیادہ۔ تاہم منتظمین کی سوچ میں اعتدال اور آفاقیت نظر آئی۔

یکم مارچ کی شام کو (چوتھے سشن میں) میرا مقالہ تھا۔ اصل مقالہ بہت لمبا ہو گیا تھا، اس لیے میں نے ۴۰ منٹ کی تقریر میں اپنے خیالات کو پیش کیا۔ میں نے کہا کہ تحفظ ملت کے میدان میں علماء نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں وسیع تر قیادت کے میدان میں وہ قائدانہ کردار ادا نہ کر سکے۔ پھر میں نے کہا کہ قائدانہ کردار سے مراد حقیقۃً داعیانہ کردار ہے۔ داعیانہ کردار کے سلسلہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ مواقع کو تلاش کر کے انھیں دعوتی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ موجودہ زمانہ میں دعوت کے بے پناہ مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کو معلوم کر کے انھیں استعمال کیا جائے۔

تقریر کے بعد حسب قاعدہ لوگوں نے سوالات کیے۔ مگر سوالات زیادہ تر جزئی نوعیت کے تھے۔ میں نے اپنے جواب میں ان کی وضاحت اصولی انداز میں کی۔ (میرا یہ مقالہ کسی قدر اضافہ کے ساتھ الرسالہ جولائی ۱۹۹۲ میں خصوصی نمبر کے طور پر شائع ہو چکا ہے)

میں نے اپنی تقریر میں خصوصیت کے ساتھ یہ بات کہی کہ اسلام کا سب سے زیادہ طاقت ور پہلو اس کا دعوتی پہلو ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے مزید نہایت موافق امکانات پیدا ہو گئے ہیں جن کو استعمال کر کے نہایت کامیابی اور تیز رفتاری کے ساتھ اسلامی دعوت کا کام کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے میں نے کئی مثالیں دیں۔ مثلاً میں نے بتایا کہ بنارس ہندو یونی ورسٹی کے ایک ہندو طالب علم نے اپنی ریسرچ کے لیے یہ مضمون لیا کہ ہندوازم میں خدا کا تصور (The concept of God in Hinduism). اس ہندو طالب علم کے ہندو پروفیسر نے کہا کہ ہندوؤں میں تو ۳۳ کروڑ گاڈ ہیں اور گاڈ کے بھی سب گاڈ ہیں۔ پھر تم کہاں تک ریسرچ کروگے اور کب تمہارا مقالہ مکمل ہوگا۔ تم اگر خدا پر ریسرچ کرنا چاہتے ہو تو بہتر یہ ہے کہ اسلام میں خدا کا تصور (The concept of God in Islam) کا مضمون لے لو۔ طالب علم نے ایسا ہی کیا اور ہندو یونی ورسٹی سے اس کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی مل گئی۔

اس طرح کی مثالیں میں نے دعوت اسلامی کے امکانات و مواقع بتانے کے لیے دی تھیں مگر ایک مسلمان بزرگ جو اسلامی دعوت کا مطلب اسلامی جہاد سمجھتے تھے انھوں نے کہا کہ یہ سب تو نکتے ہیں۔ اور پھر اس کے خلاف ایک پرجوش تقریر شروع کر دی۔

اس طرح کے تجربات مجھے بار بار ہوئے ہیں۔ ان سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا جو پڑھا لکھا طبقہ ہے اس کا ذہنی ڈھانچہ بگڑ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے اصل باتیں اس کو حقائق کے روپ میں نظر آتی ہیں اور جو حقیقی باتیں ہیں وہ اس کو اس طرح دکھائی دیتی ہیں گویا کہ وہ صرف نکتے ہوں، جن کو قابل لحاظ سمجھنے کی ضرورت نہیں۔

مسلم علماء اور دانشوروں کے متعلق میرا تجربہ ہے کہ ان کا فکر شخصیتوں کے گرد گھومتا ہے نہ کہ حقیقۃً قرآن و حدیث کے گرد۔ اس کا مظاہرہ اس سیمنار میں بھی ہوا۔ کئی لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ اپنی تقریر یا اظہار خیال میں اقبال کے اشعار کا حوالہ اس طرح دیتے رہے جیسے کہ اس کی حیثیت بھی قرآن و حدیث کی طرح ایک معتبر ماخذ کی ہے اور کسی نقطۂ نظر کے حق میں اقبال کا تائیدی شعر مل جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ نقطۂ نظر صحیح اسلامی نقطۂ نظر ثابت ہو گیا۔ حالانکہ یہ ایک غیر علمی طریقہ ہے جو علمی مجلس کے لیے ہرگز موزوں نہیں۔

میں نے اپنی تقریر میں یہ بات کہی تھی کہ قائدانہ کردار سے مراد داعیانہ کردار ہے۔ اس سلسلہ میں متعین تجویز کے طور پر میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو دوبارہ اسی قسم کا ایک ادارہ قائم کرنا چاہیے جو اقبال نے لاہور میں قائم کیا تھا مگر وہ زندہ نہ رہ سکا۔ میں نے کہا کہ ۱۹۷۱ میں میں لاہور گیا تھا۔

وہاں میری ملاقات پروفیسر یوسف سلیم چشتی (۱۹۸۴-۱۸۸۶) سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اقبال نے دعاۃ اور مبلغین کی تیاری کے لیے اشاعت اسلام کالج کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ یوسف سلیم چشتی کو اس کا پرنسپل مقرر کیا گیا تھا۔ اس میں چار سال کا کورس تھا جس میں مختلف زبانیں، تاریخ مذاہب اور تقابل ادیان وغیرہ مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ یہ ایک بے حد مفید کام تھا۔ مگر اقبال خود تو شعر گوئی میں مشغول رہے اور اس کام کو دوسروں کے ذمہ کر دیا۔ چنانچہ یہ ادارہ چار سال میں ٹوٹ گیا۔ اقبال اگر خود اپنے آپ کو اس میں وقف کرتے تو یہ ادارہ شاید ایک تاریخ ساز ادارہ ثابت ہوتا۔

جب میں نے یہ بات کہی تو اچانک لوگ بھڑک اٹھے۔ ساری گفتگو اس پر چل پڑی کہ اقبال جیسی عظیم شخصیت پر آپ نے تنقید کیوں کر دی۔ اصل بات (اشاعتِ اسلام کالج کا دوبارہ قیام) پس پشت چلا گیا۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے وہ آیت یاد آئی جس میں ہدایت یافتہ اور صاحبِ عقل ہونے کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ آدمی بات کو غور سے سنے اور پھر کلام کے بہتر مفہوم کی پیروی کرے (الزمر ۱۸)

مسلم علماء اور دانشوروں کی مجالس میں میں نے بار بار یہ بات دیکھی ہے کہ ان میں یہ مزاج موجود نہیں۔ ان کو یہ مزاج نہ قرآن سے ملا اور نہ علم سے۔ تاہم منتظمین سمینار صحت مند نقطۂ نظر کے حامل نظر آئے۔

علماء اسلام کی قائدانہ سرگرمیاں بے نتیجہ کیوں ہوگئیں۔ اس کا جواب اس حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے جو صحیح ابن حبان میں ابوذر رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے نقل کی گئی ہے۔ اس میں مومنِ عاقل کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے زمانہ کو جاننے والا ہو (ان یکون بصیرا بزمانہ)

اس معاملہ میں یہی اصل نکتہ کی بات ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ علماء کے قائدانہ عمل کے باوجود نتیجہ نہ ملنے کا واحد فیصلہ کن سبب یہ تھا کہ وہ اپنے زمانہ کے حالات سے بے خبر تھے۔ مجھے ان علماء کے اخلاص اور دیانت داری میں شبہ نہیں۔ مگر کسی کا اخلاص اس کے لیے سنت اللہ کا بدل نہیں بن سکتا۔ اخلاص کے باوجود ان کی جدوجہد میں زمانی بصیرت شامل نہ تھی۔ یہی وہ کمی ہے جس نے ان کی کوششوں کو آخری حد تک بے نتیجہ بنا دیا۔

انھوں نے بصیرِ زمانہ بنے بغیر قائدِ زمانہ بننے کی کوشش کی۔ زمانہ کی تبدیلی از سرِ نو تیاری کا تقاضا کر رہی تھی۔ مگر وہ تیاری کے بغیر اپنی موجودہ حالت کے ساتھ ہی، اقبال کے الفاظ میں، بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑے۔ یہ بلاشبہ ایک کوتاہی تھی۔ اور جو لوگ ایسی کوتاہی کریں

وہ موجودہ اسباب کی دنیا میں کبھی کسی حقیقی نتیجہ کو ظہور میں نہیں لا سکتے۔

اس سشن کے صدر مولانا محمد فاروق خاں صاحب تھے۔ انھوں نے آخر میں مفصل تقریر کی۔ انھوں نے شرکاء کے اس غیر علمی انداز پر سخت تنقید کی کہ میری بات کو الٹے مفہوم میں لے کر میرے خلاف بے معنی تقریر کرتے رہے۔ ایک اور صاحب، جناب یمین الاسلام خان انجینیر نے کہا: یہ لوگ تو آپ کے خلاف اس طرح بول رہے تھے جیسے کہ وہ پہلے ہی سے خار کھائے بیٹھے ہوں۔

مولانا محمد فاروق خاں صاحب نے میرے نقطۂ نظر کی مکمل تائید کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں معترضین کا تفصیلی جواب دیا۔ انھوں نے کہا کہ آج ہمارا یہ حال ہے کہ لوگوں کے اندر ہم ان دروازوں سے داخل ہونا چاہتے ہیں جہاں ان کی طرف سے پہرے دار بیٹھے ہوئے ہیں۔ مثلاً فخر کا دروازہ، ٹکراؤ کا دروازہ، قومی مفاد کا دروازہ، یہ سب دروازے بند ہیں۔ مگر دل کے دروازہ پر کوئی پہرے دار نہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہم بند دروازوں پر اپنا سر پٹک رہے ہیں۔ مگر کھلے دروازہ سے لوگوں کے اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔

یہاں مدارس عربیہ سے تعلق رکھنے والے کئی اصحاب سے ملاقات ہوئی۔ ان سے گفتگو کے بعد یہ ذہن تازہ ہو گیا کہ مدارس عربیہ کی بنیادی کمزوری ان کا محدود ذہن ہے۔ لکھنؤ کے ندوہ سمیت، تمام مدارس محدود دائرہ میں سوچ پاتے ہیں۔ اسی لیے ایک ایک صدی گزر جانے پر بھی ان کے یہاں کوئی حقیقی ارتقاء نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں مجھے متعدد تجربے پیش آئے ہیں۔ الجمعیۃ ویکلی سے وابستگی کے زمانہ میں میں نے ندوہ کے ذمہ دار اعلیٰ کو ایک خط لکھا کہ میں چاہتا ہوں کہ چند مہینہ ندوہ میں قیام کر کے "قرآن اور فکر جدید" کے موضوع پر طلبہ کو تیار کروں۔ اس کی صورت میں نے یہ تجویز کی کہ مجھے ندوہ کے احاطہ میں صرف ایک کمرہ قیام کے لیے دے دیا جائے۔ اس کے بعد تمام اخراجات یا انتظام میرے ذمہ ہوگا۔ میں روزانہ مقرر وقت پر درس دوں گا۔ طلبہ کو آزادی ہوگی کہ جو چاہے شرکت کرے اور جو چاہے شرکت نہ کرے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ اس سلسلہ میں آپ کی ہر شرط کو میں بلا بحث ماننے کے لیے تیار ہوں۔ مگر ندوہ کے ذمہ دار اس پروگرام کو شروع کرنے کی اجازت نہ دے سکے۔

اسی طرح میں نے جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ کے ذمہ داروں کو بھی پیش کش کی اور ان سے بھی یہی کہا کہ میں قیام کے لیے ایک کمرہ کے سوا اور کسی قسم کی کوئی چیز آپ سے نہیں چاہتا۔ ان لوگوں نے ابتداءً پسندیدگی کا اظہار کیا۔ مگر اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ اسی طرح اور بھی بعض مدارس کو میں نے اسی قسم کی پیش کش کی مگر کسی کی طرف سے مثبت جواب نہیں ملا۔

مدارس کی تمام شرطوں کو میں یک طرفہ طور پر ماننے کے لیے آمادہ تھا، اس کے باوجود انھوں نے کیوں اس بے ضرر پروگرام کو منظور نہیں کیا، اس کی وجہ فکری جمود کے سوا اور کچھ نہیں۔ فکری جمود کے ساتھ کوئی ادارہ درو دیوار کے اعتبار سے تو ترقی کر سکتا ہے۔ مگر فکری جمود کے ساتھ علمی اور ذہنی ترقی کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

ایک موقع پر میں نے کہا کہ ہمارے علماء اکثر وقتی مسائل میں الجھے رہتے ہیں۔ حالاں کہ اصل کام یہ ہے کہ تاریخی عوامل کو اپنے موافق بنایا جائے۔ مثلاً سید رشید رضا ۱۹۱۲ میں لکھنؤ آئے۔ پھر دیوبند جاکر دار العلوم میں انھوں نے تقریر کی۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ علماء سیاسی مشاغل کو چھوڑ کر تبلیغ کریں۔ اگر وہ بھرپور طور پر اس میدان میں کام کریں تو اقلیت واکثریت کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ مگر ہمارے علماء نے اس دور رس تجویز کو نظر انداز کر دیا۔ وہ اقلیت و اکثریت کے مسئلہ کے حل کے لیے مدنی فارمولا اور آزاد فارمولا پیش کرتے رہے۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مرکزی اسمبلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو برابری (parity) کا حق دے دیا جائے، حالاں کہ یہ سیلاب کے آگے تنکوں کا بند باندھنا تھا۔

ایک صاحب نے نہایت جوش کے ساتھ کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں انگریزوں نے برصغیر ہند میں ایسا تعلیمی نظام رائج کیا جس سے ہماری ذہنی غلامی برقرار رہے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ طرز فکر ہے اور اس طرز فکر نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔

اس دنیا میں ہر برائی میں کچھ اچھائی کا پہلو ضرور موجود رہتا ہے۔ انگریزوں کے رائج کردہ تعلیم کا معاملہ بھی یہی تھا۔ اس کا ایک پہلو وہ تھا جو آپ نے فرمایا۔ اسی کے ساتھ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ بین اقوامی زبان (انگریزی) سکھاتے تھے اور نئے علوم کی تعلیم دیتے تھے اور موجودہ زمانہ میں ان

چیزوں کی بے حد اہمیت تھی۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو خذ ما صفا دع ما کدر کے اصول پر عمل کرنا چاہیے تھا۔ مگر انھوں نے انتہا پسندی کا طریقہ اختیار کیا جو بے حد نقصان دہ ثابت ہوا۔

ایک صاحب نے کہا کہ دینی درس گاہیں بنجر ہو چکی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی تائید میں اقبال کا یہ شعر پڑھا :

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا　　کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

میں نے کہا کہ مدارس کے نظام میں بلاشبہ اصلاح کی ضرورت ہے۔ مگر یہ کہنا صحیح نہیں کہ مدارس بالکل بے فائدہ یا بنجر ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ندوہ نے عربی زبان و ادب کا ذوق پیدا کیا۔ اس کی وجہ سے ہمارے درمیان ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ ہیں جو عربی زبان میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھیں کی وجہ سے ہندستانی مسلمانوں اور عرب ممالک کے درمیان ربط قائم ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندستان اور ترکی کے درمیان جو دوری ہے وہی دوری ہندستان اور عرب کے درمیان پیدا ہو جاتی۔

اسی طرح دیوبند نے لاکھوں کی تعداد میں علماء پیدا کیے۔ یہی علماء ہیں جو امام، مدرس، مبلغ، واعظ، مصنف اور دوسری صورتوں میں مسلمانوں کو اسلام سے وابستہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ عام مسلمانوں اور اسلام کے درمیان علمی واسطہ ہیں۔ اگر علماء کا یہ گروہ نہ ہوتا تو عام مسلمان اسی طرح اسلام سے ناآشنا ہو جاتے جس طرح مغربی ملکوں میں جزئی طور پر نظر آتے ہیں۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی سے میں نے کہا کہ آپ کوئی ایسی بات بتائیں جو آپ کی ذاتی معرفت ہو، جس کو آپ نے خود دریافت کیا ہو۔ اس کی مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ حال میں میں نے دوسری بار حجۃ اللہ البالغہ پڑھی۔ اس کو پڑھنے کے بعد میرا تاثر یہ تھا کہ "حجۃ اللہ البالغہ دین الٰہی کی عقلی تبیین نہیں ہے، بلکہ وہ دین الٰہی کی صرف تقلیدی تبیین ہے"۔ میں نے کہا کہ ڈھائی سو سال کے درمیان کسی بھی شخص نے یہ بات نہیں کہی۔ اسی طرح آپ کوئی ایسی نئی بات بتائیے جو آپ کی اپنی دریافت ہو۔ انھوں نے حسب ذیل سطریں ایک کاغذ پر بطور "حاصل حیات" لکھ کر دیا :

"جس کسی مسلمان کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا گزرے جس میں کہ اسے اپنے مولیٰ سے شکایت ہو اور اسے یہ احساس ستائے کہ وہ وہ نہیں ہے جو کہ اسے ہونا چاہیے تھا تو اسے اپنے

ایمان کی فکر کرنی چاہیے"۔

میں نے کہا کہ یہ تو اعادہ ہے، یہ آپ کی اپنی دریافت نہیں۔

ایک اور صاحب جو اصلاح ملت کے میدان میں کام کرنے کا شوق رکھتے تھے، ان کو میں نے یہ الفاظ لکھ کر دیے: قوم کی خدمت صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو قوم کی بے توجہی کے باوجود قوم کی خدمت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

لکھنؤ میں سٹی ریلوے اسٹیشن کے پیچھے محلہ ڈیوڑھی آغا میر میں ایک قدیم درگاہ ہے۔ اس کا تعلق اٹھارویں صدی کے ایک صوفی اور عالم شاہ عبد الرحمٰن الموحد سے ہے۔ وہ بلوچستان کے قریب ایک قصبہ کوٹ مخدوم میں ۱۷۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ تقریباً ۲۰ سال کی عمر میں وہ علم ظاہر اور علم باطن کے حصول کے شوق میں گھر سے نکل گئے۔ اس دوران وہ لکھنؤ بھی آئے تھے۔ وہ ہندستان کے مختلف شہروں میں علماء وصوفیاء سے کسب فیض کرتے ہوئے سورت پہنچے۔ یہاں کشتی میں سوار ہو کر جدہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ۱۷۹۱ (رمضان ۱۲۰۵ھ) میں وہ مکہ پہنچے۔ حج وزیارت سے فارغ ہو کر ۱۷۹۵ میں ۲۸ سال کے بعد وہ وطن واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے (قومی آواز ۲۹ مئی ۱۹۹۲)

یہ دو سو سال پہلے کی بات ہے جب کہ کمیونی کیشن کے مشینی وسائل ظہور میں نہیں آئے تھے۔ اگست ۱۹۴۸ میں میں دوسری بار لکھنؤ آیا تھا۔ اس وقت میرا لڑکا شمس الاسلام اعظم گڑھ میں تھا۔ ۵ سال کی عمر میں، ۲۷ اگست ۱۹۴۸ کو اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر اسی روز ٹیلی گرام کے ذریعہ مجھے لکھنؤ میں مل گئی۔ کتنا فرق ہے قدیم دور اور جدید دور میں۔

اس وقت میں جاپلنگ روڈ پر مشتاق احمد انصاری (ڈائرکٹر جمیل انڈسٹریز) کے مکان پر تھا۔ جب مجھ کو یہ خبر ملی تو خاموشی کے ساتھ میں لوگوں کے پاس سے اٹھا۔ غسل خانہ میں جا کر وضو کیا اور اس کے بعد لکڑی کے تخت پر دو رکعت نماز ادا کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

میں جب کہیں جاتا ہوں تو عام رواج کے تحت مسجد میں مجھ سے نماز پڑھانے کے لیے کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی یہ صورت پیش آئی۔ مگر میں نے اپنی عادت کے مطابق، امامت سے احتراز کیا۔ بعد کو ایک صاحب نے کہا کہ آپ کا طریقہ بزرگوں کے خلاف ہے۔ میں نے فلاں بزرگ کے ساتھ

سفر کیا ہے۔ وہ جہاں جاتے ، ان سے امامت کے لیے کہا جاتا اور وہ شوق سے امامت کا فریضہ ادا کرتے۔

میں نے کہا کہ آپ ان بزرگوں کی پیروی کر رہے ہیں جن کے حق میں اللہ نے کوئی سلطان (آیت) نہیں اتاری۔ اور میں اس بزرگ کی پیروی کرتا ہوں جس کے حق میں اللہ کی سلطان موجود ہے۔ آپ کے مفروضہ بزرگوں کے حق میں قرآن میں کوئی آیت موجود نہیں۔ جب کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں یہ حکم موجود ہے کہ وما آتاکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھوا۔

میں نے کہا کہ میں سفر کے مقامات پر امامت سے اس لیے احتراز کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد (کتاب الصلاۃ ، باب امامۃ الزائر) میں یہ روایت موجود ہے کہ : مَن زارَ قوماً فلا یؤُمُّھم ولیؤمّھم رجلٌ منھم (جو شخص کسی قوم میں جائے تو وہ اس کی امامت نہ کرے۔ ان کا مقامی آدمی ان کی امامت کرے)

۲۹ فروری کی سہ پہر کو دار العلوم ندوۃ العلماء دیکھا۔ اس کی طرف چلتے ہوئے میں حضرت گنج کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچا تو مجھے ایک واقعہ یاد آگیا جو اسی سڑک پر گزرا تھا۔ یہاں سے میں پیدل گزر رہا تھا۔ ایک موڑ پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان اپنی بائیسکل تیزی سے دوڑاتا ہوا چلا آرہا ہے۔ موڑ پر پہنچ کر وہ ایک راہ گیر سے ٹکرا گیا جو سڑک کے کنارے آگے کی طرف جارہا تھا۔ راہ گیر گر پڑا اور بائیسکل بھی رک گئی۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی :

گھنٹی کیوں نہیں بجائی

گھنٹی نہ ہو تو

بریک کیوں نہیں لگایا

بریک نہ ہو تو

تمہارے پاس گھنٹی نہیں ، تمہارے پاس بریک نہیں۔ پھر تم تیز کیوں دوڑاتے ہو

کیا تم سے پوچھ کر دوڑاؤں

آگے بڑھے تو گومتی کے نئے پل سے گزرتے ہوئے دوبارہ ایک واقعہ یاد آگیا جو اسی پل کے اوپر گزرا تھا۔ اس زمانہ میں یہاں ایک ڈاکٹر سمیع اللہ خاں تھے۔ انھوں نے فلاسفی میں ڈاکٹریٹ کیا تھا اور برٹرینڈ رسل سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ہم دونوں اس پل سے بات کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اچانک ڈاکٹر سمیع اللہ صاحب نے کہا کہ خدا کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے پاس کرائیٹرین کیا ہے۔ میں نے کہا : وہی کرائیٹرین جو آپ کے پاس کوئی چیز ثابت کرنے کے لیے ہو۔ میرے اس جواب کے بعد ڈاکٹر سمیع اللہ صاحب خاموش ہوگئے۔ یہ شاید میری زندگی کی سب سے زیادہ کامیاب گفتگو ہے جو صرف ایک بار پیش آئی۔

دار العلوم ندوہ پہنچے تو وہاں کا پورا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ میرے زمانہ قیام میں ندوہ عمارتی حیثیت سے ایک معمولی مدرسہ تھا۔ آج وہ عمارتوں کی کثرت سے ایک پوری یونی ورسٹی معلوم ہوتا ہے۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ ندوہ کے لوگ پُر جوش طور پر یہ تقریریں کر رہے ہیں کہ ہندستان میں مسلمانوں کا قومی وجود خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ فرقہ پرست طاقتیں ان کے تشخص کو مٹانے کی مسلسل کوشش کر رہی ہیں۔ مگر ندوہ نے ۱۹۴۷ کے بعد جس طرح غیر معمولی ترقی کی ہے، اس کے لحاظ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اہل ندوہ کے پاس اس سے کہیں زیادہ بڑی ایک اور خبر ہے۔ مگر وہ اس کو اپنی تقریروں اور تحریروں میں ظاہر نہیں کرتے۔ وہ مسلمانوں کو یہ قیمتی خبر دے سکتے ہیں کہ اس ملک میں دشمنوں کی سازشوں اور مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود یہ مواقع ہیں کہ ایک مدرسہ کو بہسال کے اندر یونی ورسٹی کے درجہ تک پہنچا دیا جائے اور کوئی دشمن اس کی ترقی کو روک نہ سکے۔

مولانا ابو الحسن علی ندوی کی ایک تقریر ندوہ کے تعمیر حیات (۲۵ اپریل ۱۹۸۶) میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ بڑے فخر کی بات ہے کہ تحفظ شریعت کی موجودہ تحریک کی قیادت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور وہ لوگ کر رہے ہیں جنھوں نے دنیا بہت سے دوسرے ترقی پسند لوگوں اور پروگریسو گروہ سے زیادہ دیکھی ہے۔ جنھوں نے مغربی تہذیب کا مطالعہ ان سے زیادہ گہری نظر اور وسیع نظر سے کیا ہے۔ وہ یورپ کی اور مشرق کی تاریخ پر ان سے زیادہ وسیع اور عمیق نظر رکھتے ہیں "

اس سلسلہ میں راقم الحروف نے یکم مئی ۱۹۸۶ کو ایک خط ایڈیٹر تعمیر حیات کے نام روانہ کیا

اور ان کو لکھا کہ مولانا علی میاں نے مغربی تہذیب اور عالمی تاریخ کے ماہرین کی جس جماعت کا ذکر کیا ہے ان میں سے صرف ایک صاحب کا نام اور پتہ تحریر فرمائیں۔

اس کے جواب میں مجھے تعمیر حیات کے ایڈیٹر صاحب کا خط مورخہ ۲۹ شعبان ۱۴۰۶ ھ ملا۔ انھوں نے اس کے جواب میں میرا نام لکھ دیا اور تحریر فرمایا کہ "آپ خود جس طرح نئی تہذیب کے مسائل کی تحلیل و تجزیہ کرتے ہیں، کیا وہ یورپ سے قریب رہنے والوں کے مقابلہ میں برتری کی دلیل نہیں ہے"۔

یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے براہ راست مولانا ابوالحسن علی ندوی کو اپنا خط مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۸۶ روانہ کیا۔ اور لکھا کہ مجھے صرف ایک نام اور پتہ لکھ کر بھیج دیں۔ اس کے جواب میں ان کا خط مورخہ ۱۷ رمضان ۱۴۰۶ ھ موصول ہوا۔ ان کے جواب کے الفاظ یہ تھے: "آپ نے ان کے چند نام پوچھے ہیں۔ میں دو ہی نام کافی سمجھتا ہوں۔ ایک مولانا وحید الدین خاں صاحب اور ایک یہ ناچیز"۔

میر انیس (۱۸۰۱-۱۸۷۴) اردو کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا:

ہر دل ہے عندلیب گلستان لکھنؤ　　رضواں بھی ہے جناں میں ثنا خوان لکھنؤ

مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴) بھی لکھنؤ کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ ریاست جنجیرہ گئے۔ وہاں انھوں نے قدرتی مناظر کو دیکھا تو لکھنؤ کے تمدنی حسن پر جنجیرہ کا قدرتی حسن غالب آگیا۔ انھوں نے عطیہ فیضی کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

کہاں یہ لطف یہ منظر یہ سبزہ یہ بہارستاں　　عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی

آج لکھنؤ کی حیثیت بڑے شہروں کے مقابلہ میں ایک "گاؤں" جیسی ہے۔ ۲۸ فروری کو ایرپورٹ سے آتے ہوئے جب ہم شہر میں داخل ہوئے تو مولانا انیس الرحمٰن فلاحی نے بتایا کہ میں اس سے پہلے بمبئی میں رہتا تھا۔ اب میں بمبئی چھوڑ کر لکھنؤ آگیا ہوں۔ چند مہینہ یہاں رہنے کے بعد میری چھوٹی بچی زرین (۹ سال) نے کہا: ابا جان، دیہات میں ہم لوگ کئی مہینہ رہ چکے، اب آپ شہر چلئے۔

آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے مطابق، لکھنؤ میں ۹، پرانی عمارتیں (آثار قدیمہ) پائے جاتے ہیں۔ شہر کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ان میں سے کئی عمارتیں دیکھیں۔ تاہم بیلی گارد میں داخل ہو کر اس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھنے کا موقع ملا۔

اینگلو اودھ ٹریٹی ۱۷۶۵ میں کیا گیا۔ اس کے بعد سے برٹش انڈیا کمپنی کا ایک نمائندہ لکھنؤ میں اس مقام پر رہنے لگا جس کو آج بیلی گارد کہا جاتا ہے۔ مشہور بغاوت (غدر) کے زمانہ میں ۳۰ جون ۱۸۵۷ کو باغی فوجیوں نے بیلی گارد کو گھیر لیا۔ اس کے اندر اس وقت تقریباً تین ہزار انگریز اور ان کے وفادار سپاہی جمع تھے۔ دو مہینے سے زیادہ مدت تک محاصرہ جاری رہا۔ اس دوران باغی فوج مسلسل توپوں کے ذریعہ گولہ باری کرتی رہی۔ بیلی گارد کی عمارتوں پر گولہ لگنے کے نشانات آج بھی موجود ہیں۔ داغے ہوئے گولے بھی بعد کو جمع کر کے اس کے میوزیم میں رکھے گئے ہیں۔ اس کے احاطہ کے اندر ایک مسجد تھی۔ اس کے اونچے مینار گولہ باری سے ہل گئے تھے۔ چنانچہ بعد کو دونوں میناروں کو لوہے کے مضبوط شکنجے میں باندھا گیا جو آج تک اسی حالت میں موجود ہے۔ آخر کار سر کولن کیمپبل کانپور سے فوج لے کر آیا اور باغیوں سے لڑ کر ۲۵ ستمبر ۱۸۵۷ کو محاصرہ کا خاتمہ کیا (مزید تفصیل : الرسالہ جولائی ۱۹۹۳، صفحہ ۲۱-۲۲)

یکم مارچ ۱۹۹۲ کو جناب نثر جلیل صاحب اور چند ساتھیوں کے ہمراہ میں نے اس مقام کو دیکھا۔ اس کو دیکھتے ہوئے جب میں اس کے تہ خانے کے اندر پہنچا اس وقت یہ راز دریافت ہوا کہ طویل محاصرہ اور گولہ باری کے باوجود محصور افراد یہاں کس طرح زندہ بچے۔

بیلی گارد کے بیچ میں ایک قدیم عمارت ہے۔ اس عمارت کے نیچے ایک وسیع تہ خانہ ہے جو ۴۵ سیڑھیاں اتر کر ملتا ہے۔ محاصرہ کے دوران انگریز خاندانوں نے اسی تہ خانہ میں پناہ لی تھی۔ ان میں برٹش کمشنر سر ہنری لارنس بھی شامل تھے۔ یہ لوگ کئی مہینے تک اس میں محصور رہے۔ انگریز جب لکھنؤ میں داخل ہوئے تو خطرہ کا پیشگی اندازہ کر کے یہ وسیع اور مضبوط تہ خانہ بنایا تھا۔ اس تہ خانہ میں روشنی اور ہوا کا اتنا اچھا انتظام ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ معروف معنوں میں وہ کوئی تہ خانہ ہے۔ یہی تہ خانہ طویل محاصرہ کے دوران انگریز خاندانوں کو بچانے کا سبب بنا۔

باغی فوجوں نے توپ خانہ اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ کئی مہینہ تک وہ اس پورے علاقہ

کو اپنے گھیرے میں لے کر اس کے اوپر گولہ باری کرتی رہیں۔ مگر اس بغاوت کے پیچھے کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی اور نہ ان کو معلوم تھا کہ اندرونی طور پر انگریزوں نے کیا انتظامات کر رکھے ہیں۔ انگریز گورنر نے ٹیلی گرام پر کان پور کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے ربط قائم کیا۔ وہاں سے بڑی تعداد میں فوج آئی۔ اس نے باغیوں کو اپنے گھیرے میں لے کر ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ اس طرح یہ محاصرہ ختم ہوا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھنؤ کے تذکرہ کے تحت بتایا گیا ہے :

The best preserved monument is the Residency (1800), the scene of a heroic defence by British troops during the 1857 Indian Mutiny. (VI/374).

بیلی گارد کی اس عمارت پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ اس میں اس وقت کے ہندستانی وائسرائے لارڈ کیننگ کی ڈائری کے یہ الفاظ درج ہیں :

"There does not stand recorded in the annals of war an achievement more truly heroic than the defence of the Residency at Lucknow". Lord Canning Viceroy & Governor General of India.

جناب نثر جلیل صاحب (۴۷ سال) لکھنؤ میں اڈیشنل ڈسٹرکٹ جج ہیں۔ انھوں نے بہت سے سبق آموز تجربات بتائے۔ وہ بہت ایمانداری کے ساتھ اپنا کام کرتے ہیں۔ انھوں ۱۹۷۶ کا ایک واقعہ بتایا۔ اس وقت وہ اعظم گڑھ میں منصف مجسٹریٹ تھے۔ ان کے وطن کے ایک آدمی کا کیس ان کی عدالت میں آیا۔ اس نے چاہا کہ تحفہ وغیرہ دے کر انھیں متاثر کرے اور اپنے حق میں فیصلہ حاصل کرے۔ وہ تحفہ لے کر ان کے یہاں آیا۔ انھوں نے واپس کر دیا۔ مگر وہ نہیں مانا۔ اس نے کئی بار مختلف قسم کے تحفے پیش کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہر بار منع کرتے رہے۔ انھوں نے اس آدمی سے کہا کہ کیس میں فیصلہ کا کوئی تعلق ان چیزوں سے نہیں ہے۔ قانون کا جو تقاضا ہوگا اسی کے مطابق ہی تمہارے کیس کا فیصلہ کیا جائے گا۔

منع کرنے کے باوجود آدمی نہیں مانا اور بار بار انھیں متاثر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر ایک دن جب وہ تحفہ لے کر آیا تو نثر جلیل صاحب کو غصہ آگیا۔ انھوں نے اس آدمی کو ایک کمرہ میں بند کر کے اسے مارا۔ نثر جلیل صاحب کی والدہ کو یہ قصہ معلوم ہوگیا۔ انھوں نے اس کی خبر ان کے والد مولانا عبد السمیع صاحب کو کر دی۔ موصوف یوپی اسمبلی کے ممبر تھے اور ۱۹۷۷ میں ۲۷ سال کی عمر

میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مولانا مرحوم نے اپنے صاحبزادہ (نثر جلیل صاحب) کو ایک خط لکھا۔ اس میں کسی واقعہ کا ذکر کیے بغیر یہ درج تھا :

"تم اگر ایمان داری کرو تو تم کسی کے اوپر احسان نہیں کرتے ہو بلکہ صرف اپنی ملازمت کے تقاضے پورا کرتے ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ بد اخلاقی سے برتی گئی ایمان داری اپنا وقار کھو دیتی ہے۔"

نثر جلیل صاحب نے کہا کہ والد صاحب کے اس خط کو پڑھ کر میں نے اپنے کو بونا محسوس کیا۔ اسی طرح شروع ملازمت میں نثر جلیل صاحب نے عدالت کے ماحول کے بارہ میں شکایت کی۔ مولانا عبد السمیع صاحب نے کہا : ایمان داری کا تعلق انسان کے ضمیر سے ہوتا ہے۔ دوسروں سے حاصل کردہ سرٹیفکٹ کی بنا پر کوئی شخص ایمان دار نہیں ہو سکتا۔ ہر انسان اس معاملہ میں اپنا جج آپ ہے۔ مولانا عبد السمیع ایک پختہ کانگرسی تھے۔

ایک صاحب نے کہا کہ انڈیا میں اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جس طرح قدیم ہندستان میں یہاں خون کی ندیاں بہادی گئیں اسی طرح آج بھی یہ سازش کی جارہی ہے کہ دوبارہ مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائی جائیں۔ میں نے کہا کہ اگر فی الواقع ایسا ہے تو میں آپ کو اور مسلمانوں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اتنی خطرناک سازش کے باوجود اب بھی آپ کے لیے ممکن ہے کہ اترپردیش جیسی ریاست کی عین راج دھانی میں موجودہ سیمنار جیسا شاندار اسلامی اجتماع کر سکیں۔ ایسی حالت میں تو آپ کو پریشان ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہیے۔

ایک موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مجھے مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی کانفرنسوں میں شرکت کا بار بار اتفاق ہوا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ مقام عظمت سے بولتا ہے اور دوسرے لوگ مقام حقیقت سے۔ مسلمانوں میں تخیلاتی اپروچ ہے اور دوسروں میں حقیقت پسندانہ اپروچ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان اس پیغمبر کو بھول چکے ہیں جس نے کہا تھا کہ یا عمر انا قلیل، اور اصبروا فانی لم اومر بالقتال۔ وہ صرف اس پیغمبر کو جانتے ہیں جس کی زبان سے یہ آیت جاری ہوئی کہ قاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ۔ موجودہ مسلمانوں کو پیغمبر کی زندگی کا صرف نصف حصہ معلوم ہے۔ بقیہ نصف حصہ کی انھیں خبر نہیں۔

شہر کے درمیان چلتے ہوئے ایک بار لکھنؤ اسٹیشن سے گزرا۔ اس کا نقشہ اب بھی وہی تھا جس کو میں نے چالیس سال پہلے دیکھا تھا۔ مسافروں کی آمد و رفت کی سطح پر زندگی متحرک تھی، مگر در و دیوار کی سطح پر زندگی ٹھہری ہوئی نظر آئی۔

پہلی بار اس اسٹیشن پر غالباً میں ۱۹۴۱ میں اترا تھا۔ میرے عزیز اور بچپن کے ساتھی مسٹر عتیق احمد انصاری یہاں جاپلنگ روڈ پر اپنے والد مسٹر مشتاق احمد انصاری کے ساتھ رہتے تھے جو جیل انڈسٹریز میں ڈائرکٹر تھے۔ عتیق احمد صاحب سخت بیمار ہو گئے تھے۔ ان کو دیکھنے کے لیے میں اہل خاندان کے ساتھ لکھنؤ آیا تھا۔

لکھنؤ میں کچھ وقت مسٹر مسعود احمد کے مکان (گلستان طیبہ) پر گزرا۔ مسٹر مسعود کی والدہ انگریزی بالکل نہیں جانتی تھیں۔ مسٹر مسعود نے بی ایس سی تک کی تعلیم کالج میں حاصل کی۔ اب مسٹر مسعود کے بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ ان کی لڑکی کو انگریزی ادب کا اتنا شوق ہے کہ وہ انگریزی زبان میں اشعار موزوں کرتی ہیں۔ ان کی ایک نظم (When Nobody Cares) یہ ہے:

With no one to care,
Life's full of despair,
Life seems like a burden
Which no one can share,
There's sadness all round,
In grief you are bound
Your e'er want to cry,
Oft longing to die.
God forgive me, you say,
That's not the right way.
Face up to the knocks and the challenges of life
For love, care and happiness
Never come without strife.

۱۹۴۷ تک یہ حال تھا کہ مسلمان انگریزی پڑھنے کو نہایت برا سمجھتے تھے۔ آج یہ حال ہے کہ مسلمان انگریزی پڑھنے کو فخر سمجھتے ہیں۔ لیکن انگریزی زبان کو برا سمجھنا جتنا غلط تھا، اتنا ہی غلط یہ بھی ہے کہ اس پر فخر کیا جائے۔ اصل یہ ہے کہ زبان انسان کی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت ہے۔ وہ نہ کوئی عیب کی چیز ہے اور نہ فخر و ناز کی کوئی چیز۔

لکھنؤ کی ایک مشہور شخصیت منشی نول کشور (۱۸۳۶ - ۱۸۹۵) ہیں۔ انھوں نے ۱۹ ویں صدی

کے نصف آخر میں اردو زبان وادب کی جو خدمت کی اب بھی اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ انھوں نے ۱۸۵۸ میں لکھنؤ میں مطبع نول کشور قائم کیا۔ سرمایہ کی کمی کی بنا پر اس وقت ان کا یہ حال تھا کہ "سرکاری کاغذات طباعت کے بعد خود کاندھوں پر اٹھا کر دفتروں میں پہنچاتے تھے۔" (قومی آواز ۸ دسمبر ۱۹۹۱)

منشی نول کشور اسی زمانہ میں کلکتہ گئے۔ ان کو وائسرائے کے دربار میں مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ کاغذ سے لدا ہوا ایک جہاز یورپ سے آیا ہوا ہے مگر سامان کی ظاہری حالت اچھی نہ دیکھ کر تاجر اس کی قیمت بہت کم لگا رہے ہیں، منشی نول کشور نے دام بڑھا کر اس کو خرید لیا۔ سامان جہاز سے نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ اندر کے کاغذات نہایت اچھے ہیں۔ منشی صاحب نے کاغذ کی نصف مقدار کلکتہ میں اچھے دام پر فروخت کر دی اور آدھی مقدار کو لکھنؤ لے آئے۔ اس سودے میں ان کو اتنا زیادہ فائدہ ہوا کہ اس کی رقم سے انھوں نے لکھنؤ میں ایک بڑا مکان (کوٹھی غالب جنگ) خریدی اور نیا پریس لگایا۔

اس دنیا میں خطرہ کے بغیر فائدہ نہیں (No risk no gain) کا اصول رائج ہے۔ یہاں وہی لوگ بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں جو خطرہ مول لے کر اقدام کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

آپ منشی نول کشور کی تصویر دیکھیں تو وہ داڑھی اور پگڑی اور انگرکھا کے ساتھ اپنی صورت کے اعتبار سے بالکل مسلمان نظر آئیں گے۔ اس زمانہ میں ہندوؤں کا کلچر عام طور پر وہی تھا جو مسلمانوں کا کلچر تھا۔ زبان اور طرز رہائش کے اعتبار سے دونوں میں کوئی ظاہری فرق پایا نہیں جاتا تھا۔

ایک صاحب نے ہندستان ٹائمس (۸ دسمبر ۱۹۹۱) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے ارادے کیا ہیں۔ پارٹی کے چیف مسٹر منوہر جوشی نے اپنے مذکورہ انٹرویو میں کہا ہے کہ مسلمان ہندو ہیں :

Muslims are Hindus because they live in Hindustan.

میں نے کہا کہ ۱۹ ویں صدی کے آخر تک یہی صورت حال برعکس صورت میں قائم تھی۔ مسلم سیاست کے دباؤ کے نتیجہ میں ہندو اپنی زبان اور کلچر کے اعتبار سے بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے۔ کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ہندو مسلمان ہو گئے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہی ہندو آج خود مسلمانوں کے لیے

چیلنج بنے ہوئے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان ہندو ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس طرح کی چیزیں کسی قوم کے تشخص کو نہیں بدلتیں ہماری نظر خود اپنی اندرونی طاقت پر ہونی چاہیے نہ کہ خارجی نعروں پر۔

ایک ہندو ودوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ۶۶ سال کی عمر کے تھے اور راجہ گونڈہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں پکا ہندو ہوں۔ مگر میں روزانہ رامائن اور بائبل اور قرآن کو پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا: مگر معاف کیجئے، آپ کے قرآن میں ترتیب نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ بات یوں نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن خدائی اسلوب میں ہے اور دوسری کتابیں انسانی اسلوب میں۔

انسانی اسلوب میں بیان واقعہ کا انداز ہوتا ہے۔ اس میں کوئی بات اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہ آدمی اول سے آخر تک اسے پڑھ ڈالے۔ مثلاً بائبل میں اگر آپ پیدائش یا خروج کا باب پڑھیں تو ۵۰ صفحہ ختم کرنے کے بعد بات مکمل ہوگی۔ آپ پچاس صفحہ پڑھنے کے بعد یہ سمجھیں گے کہ اس میں کہنے والے نے کیا کہا ہے۔

مگر قرآن کا انداز واقعاتی نہیں بلکہ تذکیری ہے۔ قرآنی اسلوب کی حکمت یہ ہے کہ آپ چند سطریں یا ایک صفحہ بھی پڑھیں تو آپ کو نصیحت کی ایک بات مل جائے۔ چنانچہ آپ قرآن کا کوئی بھی صفحہ کھولیں۔ چند سطر پڑھتے ہی آپ کوئی نہ کوئی سبق یا نصیحت کی بات پالیں گے۔ قرآن کی بظاہر بے ترتیبی کثرتِ اسباق کی بنا پر ہے۔ آپ جب بھی کوئی ایسی کتاب لکھیں جس کا مقصد وہ ہو جو قرآن کا مقصد ہے تو اس کے اندر تعدد مضامین کی وہی کیفیت پیدا ہو جائے گی جس کو آپ بے ترتیبی سے تعبیر کر رہے ہیں۔ مذکورہ ہندو سے ملاقات مسعود صاحب کی دکان پر ہوئی۔

اگست ۱۹۴۸ میں میں اعظم گڑھ میں تھا۔ میرے بڑے بھائی عبد العزیز خاں صاحب کو اپنڈکس کا شدید درد اٹھا۔ مقامی سرجن ڈاکٹر انیس کو بلایا گیا۔ انھوں نے دیکھنے کے بعد کہا کہ ان کو فوراً لکھنؤ لے جائیے اور وہاں آپریشن کروائیے۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب، اپنڈکس کا آپریشن تو موجودہ زمانہ میں کوئی میجر آپریشن نہیں سمجھا جاتا۔ پھر اس کے لیے آپ ہم کو لکھنؤ کیوں بھیج رہے

ہیں۔یہیں اعظم گڑھ کے اسپتال میں اس کا آپریشن کیوں نہیں کر دیتے۔

انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس تربیت یافتہ ہینڈ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپریشن ایک بے حد نازک کام ہے۔ اس کام کے لیے ایسے ساتھی کا ہونا ضروری ہے جو بتائے بغیر باتوں کو جانے۔مثلاً ہم نے پیٹ کو چاک کر کے اپنڈکس کا آپریشن کر لیا۔ اب ضرورت ہے کہ پیٹ کے چاک کو دوبارہ سلا جائے۔ اس وقت اگر ہم کو باریک دھاگے کی ضرورت ہے۔ اور ہمارا ساتھی موٹا دھاگا سوئی میں ڈال کر ہمیں دینے لگے تو یہ مہلک ہوگا۔اس وقت ہمارے لیے یہ موقع نہیں ہوتا کہ ہم بتائیں کہ ہمیں کس قسم کا دھاگا چاہیے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا: میرے ساتھی کو جاننا چاہیے کہ آئندہ میں کیا کرنے والا ہوں۔

ڈاکٹر انیس کے یہ الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایک سرجن کو جس قسم کے ہینڈ کی ضرورت ہوتی ہے ، اسی قسم کے ہینڈ کی ضرورت ایک رہنما کو بھی ہے۔ ایسے افراد نہ ہوں تو ایک رہنما بھی اسی طرح اپنا کام صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتا جس طرح ایک سرجن۔

ڈاکٹر صاحب کے مشورہ کے مطابق ، ہم فوری طور پر بذریعہ کار لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے اور رات بھر سفر کر کے صبح کے وقت لکھنؤ پہنچے۔ اس سفر میں میرے ساتھ مولانا اقبال احمد سہیل کے صاحبزادہ مسٹر یمین الاسلام خاں بھی تھے۔ لکھنؤ میں ہم لوگ ۶ جاپلنگ روڈ پر ٹھہرے۔ میڈیکل کالج کے اسپتال میں بھائی صاحب کا آپریشن ہوا۔ آپریشن کے بعد کا وہ منظر اب تک مجھے یاد ہے جب کہ بھائی صاحب پانی کے لیے تڑپ رہے تھے اور ہم لوگ ، ڈاکٹر کی ہدایت کی بنا پر ، انھیں پانی کا گلاس دینے سے معذور تھے۔

جن دنوں بھائی صاحب لکھنؤ کے میڈیکل کالج اسپتال میں داخل تھے ، مجھ کو روزانہ وہاں جانا ہوتا تھا۔ یہاں میڈیکل کالج سے ملا ہوا شاہ مینا (وفات ۸۷۰) کا مزار تھا۔ ایک روز میں مزار کے اندر گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ قبر کے چاروں طرف سجدہ کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ منظر میں نے پہلی بار دیکھا تھا ، چنانچہ مجھے سخت جھٹکا لگا۔ میں وہاں سے چل کر اس کمرہ میں آیا جہاں گدے اور مسند کے اوپر کچھ موٹے موٹے افراد بیٹھے ہوئے تھے ، وہ غالباً مجاور صاحبان تھے۔

میں ان کے سامنے ادب سے کھڑا ہوگیا اور نہایت نرمی سے کہا کہ یہاں میں نے دیکھا کہ لوگ قبر کو سجدہ کر رہے ہیں۔ یہ تو اسلام میں حرام ہے۔ کیوں کہ سجدہ صرف ایک اللہ کے لیے ہے۔ ان میں سے ایک شخص بولا: ادھر کونے میں دیکھئے۔ میں نے دیکھا تو وہاں بانس کی کئی لاٹھیاں کھڑی کی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا: آپ کا جواب اسی سے دیا جائے گا۔ اتنے میں ایک شخص نے مجھے پیچھے سے کھینچا۔ وہ غالباً یہاں کا چپراسی تھا۔ وہ مجھ کو کمرہ سے باہر لے گیا اور کہا: میاں صاحبزادے، جاؤ، اپنا کام کرو۔ میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔

لکھنؤ کے اجتماع میں مولانا عبد الغفار ندوی (۲ ۷ سال) سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان سے مل کر کئی باتیں یاد آگئیں۔ ۱۹۴۸ میں غالباً دوسری بار میں لکھنؤ آیا تھا۔ اس وقت مولانا عبد الغفار صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ لکھنؤ میں جماعت اسلامی کے واحد رکن تھے اور جھاؤ لال کے پل پر ایک بوسیدہ کمرہ میں جماعتی پروگرام کے تحت ہفتہ وار اجتماع کیا کرتے تھے۔ ایک عرصہ تک وہ تنہا یہ اجتماع کرتے رہے۔ کیوں کہ ان کی اکیلی ذات کے سوا کوئی اس میں شرکت کرنے والا اس وقت یہاں موجود نہ تھا۔ آخر کار ایک قافلہ بنا۔ اب لکھنؤ میں پانچ مختلف مقامات پر جماعت اسلامی کے پانچ اجتماعات ہوتے ہیں۔ ان میں شرکا کی مجموعی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار ہوتی ہے۔

مولانا عبد الغفار ندوی کے ایک ایسے اجتماع میں میں بھی شریک ہوا ہوں جس میں صرف ہم دو آدمی تھے۔ انھوں نے جماعت اسلامی کی کسی کتاب کا ایک حصہ پڑھا۔ عام طور پر وہ خود ہی پڑھتے تھے اور خود ہی سنتے تھے۔ مگر اس دن ایک سنانے والا تھا، اور ایک سننے والا۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹-۱۹۰۳) ایک سے زیادہ بار لکھنؤ آئے تھے۔ ان کی پہلی آمد کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"مولانا مودودی جنوری ۱۹۴۱ میں لکھنؤ تشریف لائے۔ یہ زمانہ مسلمانوں میں بڑی بے چینی اور جوش و سرگرمی کا تھا۔ مولانا کے پر زور، فکر انگیز مضامین نے اسلامی حلقوں میں ایک جنبش اور حرکت پیدا کر دی تھی۔ نوجوان اسلام کی اُس ترجمانی کے دلدادہ تھے جو بلند سطح سے اور پر از اعتماد لہجہ میں کی جائے اور مسلمانوں میں امنگ، حوصلہ اور اپنے ماضی اور تہذیب پر اعتماد پیدا

رے۔ شہر کے مسلم نوجوان جوق درجوق آتے اور مولانا سے بڑے ذوق وعقیدت سے ملتے"۔
اسی قسم کے الفاظ مزید اضافہ کے ساتھ علامہ اقبال کے بارہ میں لکھنے والوں نے لکھے ہیں۔
اگر فی الواقع علامہ اقبال کی نظم اور مولانا مودودی کی نثر کی وہی حیثیت ہوتی جو بتائی جاتی ہے تو آج پاکستان میں اسلام کا چمنستان لہلہا رہا ہوتا جہاں انھیں کام کرنے کا موقع ملا۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ جس چیز کو بلند مضامین سمجھا گیا تھا وہ صرف بلند الفاظ تھے۔ اور بڑے بڑے الفاظ بول کر شخصی مقبولیت تو مل سکتی ہے، اس طرح کے لفظی مظاہروں سے قوموں کی تعمیر نہیں ہوتی۔
یہاں سید مختار احسن رفیقی (۱۹ سال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ جامعہ دار السلام عمر آباد میں زیر تعلیم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں تقریباً چالیس نومسلم طلبہ ہیں۔ ان کا دار الاقامہ الگ ہے۔ اور ان کے لیے دو سال کا مخصوص کورس بنایا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ نومسلم عام مسلم طالب علموں سے بہت ممتاز ہوتے ہیں۔ ان کے اندر صبر اور سنجیدگی کا مادہ ہوتا ہے۔ مثلاً مطبخ میں کھانا اگر کم پڑ جائے اور کچھ طلبہ کو بروقت کھانا نہ ملے تو عام مسلم طلبہ شور اور احتجاج کرنے لگتے ہیں۔ مگر نومسلم طلبہ بالکل خاموش رہتے ہیں اور کھانا نہ ملے تو چپ چاپ واپس چلے جاتے ہیں۔
انھوں نے بتایا کہ یہ نومسلم عام مسلم طلبہ سے زیادہ نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔ تقریباً سب کے سب تہجد کی نماز پڑھتے ہیں۔ وہ تعلیم میں زیادہ دھیان دیتے ہیں، کردار میں وہ دوسروں سے بلند ہوتے ہیں۔ نومسلم حضرات کا عام طور پر یہی حال ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نسلی مسلمانوں میں اخلاقی بلندی لانے کی ایک تدبیر یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ذریعہ بڑی تعداد میں نومسلموں کو مسلمانوں کے سماج میں داخل کیا جائے۔ اس نئے خون کی آمد پرانے خون کے اندر نئی زندگی پیدا کرنے کا سبب بن جائے گی۔
لکھنؤ کے قومی آواز (۲۹ فروری ۱۹۹۲) میں مراسلات کے کالم میں ایک مراسلہ پڑھا جس کا عنوان تھا "قرآن اور سائنس"۔ اس میں کہا گیا تھا کہ "قرآن شریف کا پڑھنا اور سننا عبادت ہے" انھوں نے لکھا تھا کہ حسن تلاوت یہ ہے "قرآن شریف پڑھ کر یا سن کر گداز قلب پیدا ہو اور آدمی کو رونا آئے۔ اللہ کی ہیبت طاری ہو۔ اس کی رحمت و مغفرت کی امید بڑھے۔ یہی قرآن شریف

پڑھنے کا حاصل ہے" ان کے نزدیک یہ مقصد اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ آدمی یہ احساس کر کے قرآن سنے کہ یہ میرے اللہ کا کلام ہے اور اللہ مجھ سے مخاطب ہے۔ مراسلہ نگار کا خیال تھا کہ قرآن مجید سے اگر سائنسی اور فلسفیانہ مسائل کا حل ڈھونڈا جانے لگے تو اس سے قرآن شریف پڑھنے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

یہ حضرات قرآن کو صرف تلاوت کی کتاب سمجھتے ہیں، وہ اس کو تدبر کی کتاب نہیں سمجھتے۔ حالانکہ قرآن کا اپنا بیان یہ ہے کہ قرآن کے تمام اعلیٰ فوائد اس پر تدبر و تفکر ہی کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔

مثلاً قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر ہم نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کر دیے۔ اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ، مختلف رنگوں کے ٹکڑے ہیں اور گہرے سیاہ بھی۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں میں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگ کے ہیں۔ اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے (فاطر ۲۷۔ ۲۸)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خشیتِ الٰہی کا تعلق علوم فطرت میں واقفیت اور غور و فکر سے ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ تدبر کو غیر اہم اور تلاوت کو اہم بتائیں وہ یقیناً قرآن کے بارہ میں ایک نازیبا جسارت کر رہے ہیں۔

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے درمیان ڈائیلاگ ختم ہو گیا ہے۔ لوگ صرف دو بات سننا چاہتے ہیں —— اپنی تائید یا اپنے دشمن کی تردید۔ کوئی بھی شخص اختلافی موضوع پر کھلے ذہن کے ساتھ تبادلۂ خیال کے لیے تیار نہیں۔

میں نے خود لکھنؤ کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ۶۷-۱۹۶۶ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی "مسلم ملی سیاست" کے زبردست حامی بنے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں اپوزیشن پارٹیوں سے مل کر کانگرس کو ہرانا چاہیے۔ اپنی نقصان رسانی کی صلاحیت کا استعمال کر کے ہم اپنا حق وصول کر سکتے ہیں۔ اپنی تقریروں میں وہ جوش کے ساتھ یہ شعر پڑھا کرتے تھے :

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے اگر کانٹوں میں ہو خوئے حریری

اس طریقہ کو مولانا علی میاں ملت کی عظیم دریافت کہتے تھے۔ بھوپال میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ "ہم نے اپنے آپ کو پالیا ہے"۔ میں اس طرز فکر سے مطمئن نہ تھا۔ میں نے مولانا علی میاں سے خط وکتابت کی اور ان سے ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ مگر انھوں نے وقت دینے سے انکار کیا۔ اس سلسلہ میں ان کا آخری خط یہ تھا :

"جواباً صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جو جملہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا اور جس کی تشریح آپ کرانا چاہتے ہیں، اس کو مجذوب کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کر دیجئے۔ اس موضوع پر مزید خط وکتابت نہ کی جائے"۔ (۲۹ اپریل ۱۹۶۷)

مولانا علی میاں نے لکھا تھا کہ اس سلسلہ میں ان کے خصوصی رفقاء مولانا محمد منظور نعمانی اور ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی سے بات کر لی جائے۔ ۱۵ اپریل ۱۹۶۷ کو لکھنؤ میں گوئن روڈ کی مسجد میں مولانا محمد منظور نعمانی سے ملاقات کی۔ کئی گھنٹہ کی گفتگو میں جب میں نے معاہداتی سیاست کے بارہ میں مولانا کی تمام دلیلوں کو منہدم کر دیا تو انھوں نے فرمایا : مگر اس میں منفی فائدہ تو ہے۔ منفی فائدہ سے ان کی مراد یہ تھی کہ کانگرس کو شکست دے کر ہم اپنی اس قوت کا مظاہرہ کریں گے کہ ہم سیاسی نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ میں یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا کہ اس میں منفی فائدہ بھی نہیں، البتہ ہمارا اپنا نقصان ضرور ہے۔ اور وہ ہے ملک میں فرقہ وارانہ زہر کا اضافہ۔

ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی سے ۱۶ اپریل ۱۹۶۷ کو حضرت گنج میں ان کے مطب میں ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ "کانگرس ہراؤ سیاست" کے چیمپین بنے ہوئے تھے۔ تقریباً پون گھنٹہ کی گفتگو میں میں نے ان کے تمام دلائل کو رد کر دیا۔ جب ان کے پاس اپنے حق میں کوئی دلیل باقی نہیں رہی تو آخر میں انھوں نے کہا : مگر اسٹیٹس کو میں چیلنج تو ہوگا۔ چونکہ وہ مزید گفتگو کے لیے آمادہ نہ تھے اس لیے میں غم ناک دل کے ساتھ واپس چلا آیا۔

میں اس معاملہ میں کتنا زیادہ غم ناک تھا۔ اس کو بتانے کے لیے میں صرف ایک حوالہ دوں گا۔ الجمعیۃ ویکلی (۲۰ اکتوبر ۱۹۶۷) میں ایک تفصیلی مضمون کے تحت میں نے لکھا تھا :"مسلمانوں کی سیاست کا یہ موڑ ذاتی طور پر راقم الحروف کے لیے اس درجہ تشویش ناک تھا کہ اس کو سوچ کر اکثر میری راتوں

کی نیند اڑجاتی۔ مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب الکشن (اگست، ۱۹۶۷) سے پہلے لکھنؤ کے ایک شاندار اجتماع میں اس قبیلۂ قیادت کے ایک نمایاں ترین بزرگ اپنی خطابت کے جوہر دکھا رہے رہے تھے اور میرا حال یہ تھا کہ میں سامعین کے مجمع میں بیٹھا ہوا زار و قطار رو رہا تھا۔ انتہائی بے تابی کے عالم میں بار بار میری زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے: خدایا، جس ملت کے ناخدا ایسے نادان مقررین ہو جائیں اس ملت کا انجام کیا ہوگا۔' (الجمعیۃ ویکلی، ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۷، صفحہ ۱۶)

ایک ہندو بھائی سے ملاقات ہوئی۔ ان کا تعلق بھارتیہ جنتا پارٹی سے تھا۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۹۱ کے الکشن میں بھارتیہ جنتا پارٹی رام مندر کی تعمیر کا نعرہ لے کر چناؤ لڑی اور بھاری ووٹوں سے کامیاب ہوئی۔ اس طرح یوپی کے ووٹوں کی اکثریت نے اس کو حق دے دیا کہ وہ رام مندر بنائے تو اب جمہوری منطق کے مطابق بھارتیہ جنتا پارٹی کو رام مندر کی تعمیر کا حق ہونا چاہیے اور کسی کو اس میں رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہیے۔

میں نے کہا کہ آپ نے ادھوری بات کہی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کا نعرہ تین چیزوں کے لیے تھا —— روٹی، انصاف اور رام مندر۔ کیا آپ کی پارٹی نے ریاست میں پہلا دونوں کام کر لیا ہے کہ اب وہ تیسرے کو کرنے کے لیے بے قرار ہو رہے ہیں۔

۱۹۹۱ کے الکشن میں اگرچہ بی جے پی اس حد تک کامیاب ہوئی کہ اس نے یوپی میں ریاستی گورنمنٹ بنالی۔ مگر رپورٹوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بی جے پی کے اندرونی حلقے اپنے مستقبل کے بارہ میں مایوسی میں مبتلا ہیں۔ بی جے پی کے ایک ممبر نے کہا: ہم دونوں بار اچھل رہے (ٹائمس آف انڈیا ۱۰ فروری ۱۹۹۲)

شری لال کرشن ایڈوانی نے پہلی رتھ یاترا نکالی۔ اس کو سومناتھ سے روانہ ہو کر اجودھیا پہنچنا تھا۔ مگر وہ اجودھیا پہنچنے سے پہلے بہار میں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد شری مرلی منوہر جوشی نے دوسری رتھ یاترا نکالی۔ اس کو کنیا کماری سے چل کر ۲۶ جنوری ۱۹۹۲ کو سری نگر پہنچنا تھا مگر جموں پہنچ کر وہ بھی منتشر ہو گئی۔

منفی بنیاد پر اٹھنے والی تحریکیں ہمیشہ ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں۔ ایسی کسی تحریک کے بارہ میں بہترین تدبیر یہ ہے کہ ردعمل کے بجائے انتظار کی پالیسی اختیار کی جائے۔ ردعمل کی پالیسی

ایسی تحریکوں کی عمر کو بڑھاتی ہے اور انتظار کی پالیسی اس کی عمر کو مزید کچھ اور کم کر دیتی ہے۔

ایک صاحب نے نصیحت کے لیے کہا۔ میں نے ان کی نوٹ بک پر یہ جملہ لکھ دیا :

قوم کی خدمت صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو
قوم کی بے توجہی کے باوجود قوم کی
خدمت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

ایک اور صاحب کو یہ جملہ لکھ کر دیا :

ہر آدمی اپنی ذات کے معاملہ میں پریکٹیکل پسند ہے
اور دوسروں کے معاملہ میں آئیڈیل پسند۔

لکھنؤ کی یادوں میں سے ایک یاد مولانا عبد الباری ندوی (۱۹۷۶-۱۸۹۰) کی ہے۔ میرے دل میں ان کی بہت عزت تھی۔ وہ بھی مجھ سے بہت زیادہ محبت فرماتے تھے۔ پہلی بار میں ان سے ۱۹۶۳ کے آغاز میں لکھنؤ میں ملا تھا۔ ان کو میں نے "تعبیر کی غلطی" کا پورا مسودہ دکھایا۔ پھر ان کی تصدیق اور اتفاق کے بعد اس کو اشاعت کے لیے دیا۔

اس کے بعد کئی بار ان سے میری خط وکتابت ہوئی۔ اپنے ایک خط میں انھوں نے میرے بارہ میں لکھا : "باقی میرے نزدیک تو آپ جدید طبقہ کی طرف مبعوث ہیں"۔ اپنے اسی حسن ظن کی بنا پر انھوں نے یہ پیش کش کی تھی کہ لکھنؤ (سیتاپور روڈ) میں اپنے وسیع مکان کو وہ "اسلامک ہوسٹل" کے نام پر وقف کر دیں اور مجھ کو اس کا نگراں بنا دیں۔ اس میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کو ٹھہرا کر ان کی اسلامی تربیت کی جائے۔ تاہم بعض وجوہ سے میں اس کو قبول نہ کر سکا۔

انھوں نے اپنی کتاب (مذہب اور سائنس) کا مسودہ مجھے دیا تھا کہ میں اس کو ری رائٹ کر دوں۔ مگر میں یہ خدمت بھی انجام نہ دے سکا۔ بعد کو ۱۹۷۱ میں یہ کتاب مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (لکھنؤ) سے اسی طرح شائع کی گئی ہے۔ یہ ایک مفید کتاب ہے۔ تاہم اپنی موجودہ صورت میں وہ ایک قسم کا مجموعہ اقتباسات ہے۔ اس میں وہ تجزیہ وتحلیل موجود نہیں جو اس موضوع سے تعلق رکھنے والی کتاب میں ہونا چاہیے۔

۱۹۶۶ کے آخر میں میں نے دو ہفتہ ان کے مکان پر قیام کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ان

کے وسیع مکان کے ایک بیرونی کمرہ میں ڈاکٹر فیاض الاسلام (علی گڑھ) اور مولانا عبد المجید ندوی، ایم اے رہتے تھے۔ مولانا عبد المجید صاحب آخر عمر میں مدرسۃ الاصلاح (سرائمیر) کے صدر مدرس تھے۔ ۲۳ مئی ۱۹۹۱ کو اعظم گڑھ کے قریب ایک سڑک کے حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اس قیام کے دوران ایک روز ایسا ہوا کہ مولانا عبد الباری مرحوم اپنی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ میں نیچے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ گفتگو کے دوران مجھ پر خاص کیفیت طاری ہوئی۔ میں نے مولانا کے پیروں پر اپنا دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: مولانا آپ مجھے بیعت فرمالیں۔ مولانا نے فرمایا کہ تم تو پیدائشی صوفی ہو۔ پھر بھی میں تم کو اسی طرح اپنی بیعت میں لیتا ہوں جس طرح حضرت تھانوی نے مجھ کو اپنی بیعت میں لیا تھا۔ (واضح ہو کہ مولانا مرحوم حضرت تھانوی کے خلیفہ مجاز تھے) اس طرح گویا میں مولانا عبد الباری صاحب کے واسطہ سے حلقۂ تھانوی میں شامل ہوں۔ مزید یہ کہ لوگ اپنے شیخ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بیعت ہوتے ہیں۔ میں اپنے شیخ کا پاؤں پکڑ کر ان سے بیعت ہوا ہوں۔

راقم الحروف کے بارہ میں ایک صاحب نے بے بنیاد تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے —

"ہمارے مولانا عبد الباری صاحب ندوی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ کبیر بننے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کسی کے سامنے صغیر بنا ہو، ورنہ وہ فتنہ بنتا ہے۔ وحید الدین خاں صاحب کی کمی یہی ہے کہ وہ صغیر بننے سے پہلے کبیر بن گئے۔ ان کی ادعائی تحریریں دن بہ دن جادۂ اعتدال سے ہٹتی جارہی ہیں۔" (ماہنامہ الرشاد، مارچ۔ اپریل ۱۹۹۱، صفحہ ۶۰)

راقم الحروف کو دعویٰ تو درکنار، غلط فہمی کے درجہ میں بھی کبیر ہونے کا گمان نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے کو کبیر سمجھنا شرک کی نوعیت کا گناہ ہے۔ کیوں کہ کبیر صرف ایک ہے، اور وہ اللہ رب العالمین کی ذات ہے۔ تاہم یہ عجیب بات ہے کہ جس مولانا عبد الباری ندوی کے حوالے سے مذکورہ بات کہی گئی ہے، اسی کے ساتھ میرا وہ واقعہ گزرا جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔

۱۹۶۷ میں میں نے الجمعیۃ ویکلی (دہلی) کی ادارت قبول کی۔ صرف میرے تعلق کی بنا پر مولانا عبد الباری صاحب مرحوم الجمعیۃ ویکلی دیکھنے لگے، جب کہ اس سے پہلے وہ اس کو نہیں پڑھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یاد ہے۔ الجمعیۃ ویکلی (۲ فروری ۱۹۶۸) میں میرا ایک مضمون چھپا۔ اس کا عنوان تھا: دیوار قہقہہ۔ اس مضمون سے پہلے اکتوبر ۱۹۶۶ میں میں نے اپنے لڑکے

ڈاکٹر ظفر الاسلام کو تعلیم کے لیے قاہرہ بھیجا تھا۔ مولانا کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ کیوں کہ وہ قاہرہ کو مقبورہ کہتے تھے۔ مذکورہ مضمون پڑھنے کے بعد مولانا نے مجھے لکھا : آپ نے اپنے بیٹے کو دیوار قہقہہ پھندوا ہی دی۔

شخصیتوں پر مضمون لکھنے کا مجھے ذوق نہیں۔ تاہم مولانا عبد الباری ندوی پر میں نے ایک مضمون لکھا تھا جو اسی زمانہ میں الجمعیۃ ویکلی کی دو قسطوں (۷ مارچ، ۱۴ مارچ ۱۹۶۹) میں چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا: "مسٹر مولوی"۔ مسٹر مولوی، مولانا مرحوم کا وہ نام ہے جو مسٹر بین (F.W. Bain) نے ان کو دیا تھا۔ مسٹر بین دکن کالج پونہ کے پرنسپل تھے۔ مولانا اس کالج میں ۱۹۱۴ میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے آئے اور تقریباً چار سال یہاں رہے۔ الجمعیۃ کے مضمون کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :

"مسٹر بین، مولانا کے الفاظ میں، اپنی قسم کا انوکھا آدمی تھا۔ مولانا عبد الباری نے فرمایا کہ اس طرح کا آدمی میں نے اپنی زندگی میں دوسرا نہیں دیکھا۔ مسٹر بین انگلینڈ جانے لگے تو انھوں نے وداعی پارٹی میں بولتے ہوئے کہا کہ مسٹر مولوی کبھی میرے بنگلہ پر مجھ سے ملنے نہیں آئے۔ انھوں نے کبھی میرے نام کرسمس کارڈ نہیں بھیجا۔ کبھی کوئی تحفہ مجھ کو پیش نہیں کیا۔ مگر اس کے باوجود میں ان سے بہت خوش ہوں، اور میرے دل میں ان کی بہت قدر ہے۔ کیوں کہ وہ ہمیشہ اپنے کام کو بہترین طور پر انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں"

مسٹر بین نے پونہ سے واپس جاتے ہوئے مولانا عبد الباری صاحب کو بلایا۔ جب وہ مسٹر بین کے دفتر میں پہنچے تو اس نے اپنی میز کی دراز کھولی اور اس میں سے کاغذوں کی ایک گڈی نکالی۔ اس نے کہا کہ مسٹر مولوی، یہ سب آپ کے خلاف شکایتوں کی چٹیں ہیں۔ مسٹر ہوم جی (آیندہ ہونے والے پرنسپل) مسلسل آپ کے خلاف شکایتیں لکھ لکھ کر بھیجتے رہے ہیں۔ صرف میں ان کے اور آپ کے درمیان روک بنا ہوا تھا۔ مگر اب میرے بعد آپ یہاں نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ مسٹر بین کے جاتے ہی مولانا عبد الباری صاحب کو دکن کالج سے ہٹا دیا گیا۔

مسٹر بین جیسے عالی ظرف افراد ہی کوئی بڑا ادارہ قائم کرتے ہیں۔ جن افراد کے اندر یہ عالی ظرفی نہ ہو وہ صرف سطحی لوگوں کی سرائے بنائیں گے نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی بڑا انسانی ادارہ۔

ایک اردو ہفت روزہ (۲۸ فروری ۱۹۹۲) میں دو صفحہ کا ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان تھا: روہنگیا مسلمانوں پر برمی فوج کے مظالم کی انتہا۔ یہ مضمون ایک برمی مسلمان کے قلم سے تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اراکان کے مسلمانوں کی آزادی کی تحریک کو برمی حکومت بے رحمانہ طور پر کچل رہی ہے اور اس کا سلسلہ ۱۹۳۰ سے جاری ہے۔ ۱۹۵۰ سے اراکان کے مسلمان اپنی آزادی کے لیے گوریلا تحریک چلا رہے ہیں۔ اس مدت میں دو لاکھ سے زیادہ مسلمان شہید ہو چکے ہیں اور تقریباً دو لاکھ مسلمان جان بچا کر بنگلہ دیش پہنچ گئے ہیں اور وہاں بدترین افلاس کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۶ فروری ۱۹۹۲) میں ایک روہنگیا لیڈر کا انٹرویو چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: الحكومة البورمية اقرت مخططا لا بادتنا۔

اس کو پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ ندوہ کے زمانہ قیام میں ایک روز ندوہ کے ایک سینیر استاد میرے کمرہ میں آئے اور رازداری کے ساتھ فرمایا کہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں ہندستان چھوڑ کر اراکان چلا جاؤں۔ برما کے اس سرحدی علاقہ میں بیشتر مسلمان آباد ہیں اور وہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کے روشن امکانات ہیں۔ میں نے اس منصوبہ سے اختلاف کرتے ہوئے رفاقت سے معذوری ظاہر کی۔ اس پر وہ بگڑ گئے اور مجھ کو بزدل اور بے ہمت وغیرہ کا الزام لگانے لگے۔ مذکورہ استاد اراکان تو نہیں گئے۔ البتہ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ وہ پاکستان چلے گئے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں یہ سیاست عام ہے کہ کسی ملک کے ایک حصہ میں اگر ان کی اکثریت ہے تو اس حصہ کو بقیہ ملک سے الگ کر کے وہاں وہ خود مختار مسلم حکومت یا آزاد اسلامی حکومت قائم کرنے کی تحریک چلانے لگتے ہیں۔ میرے نزدیک اس سیاست کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔ اس احمقانہ سیاست کے نتیجہ میں ملک کی حکومت جب ان کے اوپر سختی کرتی ہے تو دوسرا کام انھیں یہ مل جاتا ہے کہ ملکی حکومت کے مظالم کے خلاف سطحی قسم کے بیانات اور مضامین چھاپتے رہیں۔ اس کا نام اگر اسلام ہو تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ غیر اسلام کس چیز کا نام ہوگا۔

لکھنؤ پچھلی کئی صدیوں تک مسلم حکمرانوں اور مسلم نوابوں کا مرکز رہا ہے۔ اس بنا پر وہاں مسلم عہد کی بہت سی تاریخی عمارتیں پائی جاتی ہیں۔ "چھتر منزل" سے گزرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ یہ محلات اُس زمانہ میں کتنی زیادہ لایعنی سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

مثال کے طور پر اس زمانہ میں مسلم نوابوں کے یہاں ایک مستقل عہدہ "داستان گو" کا ہوا کرتا تھا جو فرضی قسم کی افسانوی کہانیاں سنا کر نواب اور ان کے درباریوں کو محظوظ کرتا تھا، حکیم سید اصغر علی لکھنوی (م ۱۸۷۹) اسی قسم کے ایک داستان گو تھے۔ وہ واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ ہونے کی بنا پر اپنے نام کے ساتھ "داستان گوئے سلطانی" لکھا کرتے تھے۔ وہ دیووں اور پریوں کی خیالی کہانیاں بیان کرنے کے ماہر تھے۔

ندوہ جاتے ہوئے میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے گزرا جو پہلے کیننگ کالج تھا۔ سر چارلس جان کیننگ ۱۸۵۶ میں گورنر جنرل کی حیثیت سے انڈیا آیا۔ اس نے یہاں کئی تعلیمی ادارے قائم کیے۔ اس میں سے ایک کیننگ کالج بھی تھا۔ میں نے سوچا کہ جس زمانہ میں دوسری قومیں علوم حقیقی میں مہارت پیدا کر رہی تھیں، مسلم امراء داستان سرائی کرنے والوں سے اپنی بزم سجا رہے تھے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کا جو انجام ہوا اس کو انھیں اپنی غفلت کے خانہ میں درج کرنا چاہیے نہ کہ وہ اس کو دوسروں کی سازش کا نتیجہ بتا کر ان کے خلاف احتجاج کرنے لگیں۔

لکھنؤ کی تہذیب فنون لطیفہ اور شعر و شاعری کی تہذیب تھی۔ اس کو شاہ جان عالم اور نواب واجد علی جیسے لوگوں نے بنایا تھا۔ صنعتی انقلاب نے اس تہذیب کی بالادستی ختم کر دی۔ تاہم مزاج کے اعتبار سے وہ اب بھی پائی جاتی ہے۔ یہاں کے ایک شاعر ظریف لکھنؤ (۱۹۳۷ – ۱۸۷۰) کا ایک شعر اپنے محبوب کے بارہ میں ہے :

کوئی ہے اطلاع اس وقت کر دے جا کے تھانہ میں وہ میرے قتل پر کھینچے ہوئے تلوار بیٹھے ہیں

نہ کہیں محبوب ہے اور نہ کہیں محبوب کی تلوار۔ شاعر اپنے تخیل کی دنیا میں خیالی مضمون بندی کر رہا ہے۔ اس مضمون بندی کا نام شاعرانہ اسلوب ہے۔ یہ اسلوب اردو زبان میں اتنا چھایا ہوا ہے کہ ہمارے مسلم مفکرین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ تقریباً تمام مصلحین و مفکرین اسلام کو موضوع بنا کر اسی قسم کی مضمون بندی کر رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جس چیز کو اسلامی ادب کہا جاتا ہے کہ وہ اسی مضمون بندی کا دوسرا نام ہے۔

لکھنؤ کی یادوں میں سے ایک یاد م نسیم صاحب بھی ہیں۔ یہاں ان کی سگریٹ ایجنسی تھی۔ پھر بعض اسباب سے ایجنسی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد وہ امریکہ چلے گئے۔ انھوں نے لکھنؤ سے

ایک ادبی ماہنامہ "نئی نسلیں" کے نام سے جاری کیا تھا۔ ۵۵-۱۹۵۴ میں اس میں میرے چند مضامین شائع ہوئے۔ ان کے عنوانات یہ ہیں :

زندگی میں شعر کا مقام

شاعری —— اس کا فن اور کردار

شعر کی موجودہ ہیئت میں اصلاح کی ضرورت

شعر کی موجودہ ہیئت (اعتراضات کا جواب)

ارادہ ہے کہ ان مضامین کو ، دوسرے اسی قسم کے مضامین کے ساتھ ، "ادبیاتِ اسلام" کے نام سے ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔

م نسیم صاحب کے بارہ میں ایک مضمون اخبار قومی آواز (۸ دسمبر ۱۹۹۱) میں نظر سے گزرا۔ یہ ان کے دوست ڈاکٹر سید عبد الباری کے قلم سے تھا۔ اس میں نہ کوئی واقعہ ہے اور نہ کوئی تجزیہ۔ پورا مضمون شعری اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر م نسیم صاحب بعض حالات کے نتیجہ میں لکھنؤ سے ایک امریکی شہر میں چلے گئے۔ اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

" زمانہ کی گردشوں نے انھیں اپنے محبوب شہر میں نہ رہنے دیا اور وہ اسلامی نشأۃ ثانیہ کی آرزو لیے ہوئے دیارِ فرنگ کی طرف چل دیے۔ ان کی شخصیت بکھر کر پورے کرۂ ارض پر پھیل گئی "

یہ شعری اسلوب موجودہ زمانہ میں تمام مسلم اہل قلم کے یہاں عام ہے۔ دورِ جدید کا تقریباً پورا اسلامی ادب اسی اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں کوئی بھی مسلم مصنف نظر نہیں آتا جس نے اسلام کو وقت کے سائنٹفک اسلوب میں پیش کیا ہو۔ یہ شعری اسلوب جاگیرداری دور میں پیدا ہوا تھا۔ صحابہ کرام نے اسلام قبول کیا تو ان کے یہاں خود بخود جاہلی دور کے شاعرانہ اسلوب کا خاتمہ ہو گیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین اور مصلحین کا حال یہ ہے کہ زمانہ کی انقلابی تبدیلیاں بھی انھیں اس پر مائل نہ کر سکیں کہ وہ زوال یافتہ دور کے شعری اسلوب کو ترک کر دیں۔

میں لکھنؤ میں تین سال رہا ہوں۔ اس کے علاوہ بار بار وہاں جانا ہوا ہے۔ اس لیے یہاں لکھنؤ کے جس حصہ سے بھی گزرا کچھ یادیں ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ حضرت گنج کی طرف جانے والی سڑک پر ایک بہت بڑا امکان ہے۔ اس میں سید صدیق حسن، آئی سی ایس (وفات ستمبر ۱۹۶۲) رہا کرتے تھے۔ وہ ایک لائق افسر ہونے کے ساتھ نہایت شریف انسان تھے۔ ہندو اور مسلمان سب ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کا ایک سبق آموز قصہ یہ ہے:

۱۹۳۲ کا واقعہ ہے۔ فتح گڑھ (اتر پردیش) کے علاقہ میں سکھوا نام کے ایک ڈاکو نے سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ پولیس کو خوف زدہ کرنے کے لیے پولیس کے افراد کو خاص طور پر وہ اپنی گولی کا نشانہ بناتا تھا۔ مگر اسی زمانہ میں ایک اعلیٰ انتظامی افسر اس کی دہشت گردی کی فہرست سے مستثنیٰ تھا۔ یہ سید صدیق حسن صاحب تھے۔ سکھوا ڈاکو نے گرفتاری کے بعد خود بتایا کہ وہ اکثر رات کے وقت صدیق حسن صاحب کے بنگلہ پر آتا تھا۔ مگر محض ان کی شرافت کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے ان پر گولی نہیں چلائی۔

صدیق حسن صاحب اس زمانہ میں فتح گڑھ میں جوائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ سکھوا ڈاکو کی گرفتاری خود انھیں کی ایک مہم کے تحت عمل میں آئی۔ اور انھیں نے اس کے مقدمہ کی سماعت کرکے اس کو سزائے قید کا حکم سنایا۔

اس کے باوجود صدیق حسن صاحب کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر سکھوا ڈاکو ان کی اتنی عزت کرتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ جب وہ اس کو گرفتار کرکے اپنے بنگلہ پر لائے تو یہ سردی کا زمانہ تھا۔ سکھوا نے رات کے وقت ان سے کہا: جنٹ صاحب، آپ کا سکھوا سردی کھا رہا ہے۔ یہ سن کر صدیق حسن صاحب فوراً گھر کے اندر گئے۔ اپنی ایک نئی قمیص اور ایک موٹا کمبل لائے اور اس کو سکھوا ڈاکو کے حوالے کر دیا (الجمعیۃ ویکلی، ۱۰ مئی ۱۹۶۸)

۱۵ ستمبر ۱۹۶۲ کو میں ندوہ کے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی دعوت پر لکھنؤ پہنچا۔ یہاں ندوہ کی قدیم عمارت کے اوپر کے ایک کمرہ میں میرا قیام تھا۔ تقریباً تین سال تک یہاں میرا قیام رہا۔ اس زمانہ قیام کی بعض یادداشتیں یہاں قلم بند کی جاتی ہیں:

اسی زمانہ میں مولانا محمد تقی امینی (۱۹۹۱-۱۹۲۶) بھی یہاں مقیم تھے۔ ان کا کمرہ میرے کمرہ

سے قریب تھا۔ ان کے کمرے میں دو دروازے تھے۔ ایک روز انھوں نے پچھلے دروازہ کو اندر سے بولٹ کیا اور دوسرے دروازہ کو بند کر کے اس کا پیڈ لاک دبا دیا۔ بعد کو انھیں خیال آیا کہ تالے کی کنجی تو کمرے کے اندر رہ گئی۔ میرے لڑکے ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں آئے۔ انھوں نے ایک لحہ تالہ والے دروازے کو دیکھا اور اس کے بعد جاکر دوسرے دروازے کو زور زور سے ہلانے لگے۔ بظاہر مجھے یہ بات عجیب معلوم ہوئی۔ میں نے کہا کہ دروازہ تو سامنے کا بند ہوا ہے اور تم پچھلے دروازہ کے ساتھ زور آزمائی کر رہے ہو۔ وہ جواب دیے بغیر اس کو ہلاتے رہے۔ یہاں تک دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھلنے کا سبب یہ تھا کہ اس کے اندر کا بولٹ ہل کر سیدھا ہوا اور پھر وہ کھسک کر نیچے آگیا۔ اس طرح دروازہ کھل گیا۔ میں نے ظفر الاسلام خاں کو شاباشی دیتے ہوئے کہا کہ تم نے اپنے عمل سے زندگی کا ایک سبق دیا ہے۔ اس طرح تم نے مظاہرہ کی سطح پر بتایا ہے کہ دروازہ کہیں اور بند ہوتا ہے اور اس کو کھولنے کا راز کہیں اور موجود رہتا ہے۔

ابتدائی طور پر ندوہ کو ۱۸۹۲ میں مولانا محمد علی مونگیری نے قائم کیا تھا۔ تاہم جس شخص نے ندوہ کو ندوہ بنایا وہ مولانا شبلی نعمانی تھے۔ اگرچہ ان کی زندگی ہی میں ندوہ میں ان کی اتنی مخالفت کی گئی کہ ان کو ندوہ چھوڑ دینا پڑا۔ شبلی کے اس فارسی شعر میں اسی صورت حال کی طرف اشارہ ہے:

از بہاں بزم کہ جز من دگرے راہ نداشت   باید م رفت کہ بہر دگراں جا باشد

کہا جاتا ہے کہ ندوہ کا مقصد یہ تھا کہ نئے حالات اور نئے زمانہ کے مطابق مسلم رہنما پیدا کیا جائے۔ مگر جہاں تک میرا اندازہ ہے، اس پوری مدت میں ندوہ کوئی بھی ایسا رہنما پیدا نہ کر سکا۔ جدید دور کے رہبر پیدا کرنا تو بہت بڑی بات ہے، جدید تقاضوں کے مطابق، کوئی ایک کتاب بھی اہل ندوہ تیار کر کے دنیا کو نہ دے۔ ان کی تمام مطبوعہ کتابیں تقلیدی نوعیت کی کتابیں ہیں نہ کہ جدید نوعیت کی۔ مولانا عبد اللہ عباس ندوی نے ندوہ کے تعارف میں ایک مفصل مضمون قومی آواز ۱۹ جنوری ۱۹۹۲ میں شائع کیا تھا، اس کا ایک حصہ یہ تھا:

"مسلمانوں کا کوئی کام ایسا نہیں دیکھا گیا جس کی مخالفت خود مسلمانوں نے نہ کی ہو۔ ندوہ ابھی

ابتدائی دور میں تھا کہ اس کی مخالفت کا بازار گرم ہوگیا۔ تمام علماء کرام جن میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا محمد علی مونگیری، علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید عبدالحیٔ جیسے آفتاب و ماہتاب پر کفر کا فتویٰ صادر ہوگیا۔ یہی نہیں بلکہ جو ان کو کافر نہ سمجھے وہ بھی کافر گردانا گیا۔ ندوہ کی مخالفت کے لیے چار رسالے جاری کیے گئے۔

مولانا عبد اللہ عباس ندوی نے مزید لکھا ہے کہ ندوہ کے خلاف عوام میں خوب نفرت پھیلائی گئی۔ بڑے بڑے مدارس کے سفراء بمبئی اور کلکتہ جاتے تو لوگوں کو بتاتے کہ ندوہ ایک کالج ہے جہاں اتوار کو چھٹی ہوتی ہے اور انگریزی طرز رہائش ہے۔ اور یہاں کے پڑھے ہوئے لوگوں کو سوائے عربی اخبارات پڑھنے کے کچھ نہیں آتا۔ (قومی آواز ۱۹ جنوری ۱۹۹۲)

عجیب بات ہے کہ آج یہی اہلِ ندوہ الرسالہ کے دینی مشن کے خلاف خود بھی اسی قسم کا بے بنیاد طوفان اٹھائے ہوئے ہیں۔ ۱۸۹۸ میں ندوہ قائم ہوا تو اس وقت کے قدامت پسندوں کو وہ "جدید" معلوم ہوا۔ اس کو دین سے انحراف سمجھ کر وہ اس کے مخالف بن گئے۔ آج اسی ندوہ کو الرسالہ مشن دوبارہ جدت اور انحراف کا کیس دکھائی دیتا ہے۔ حتیٰ کہ الرسالہ مشن کے رد میں اہلِ ندوہ کو دلائل نہیں ملے تو انھوں نے اس کے خلاف تنقیص، عیب جوئی اور الزام تراشی کی مہم شروع کر دی۔

قدامت پسند لوگ کسی نئی چیز کا استقبال ہمیشہ اسی طرح کیا کرتے ہیں۔ سو سال پہلے ندوہ "جدید" کے ہم معنی تھا، اس لیے قدامت پسند ذہن اس کے مخالف ہوگئے۔ اب خود ندوہ ایک قدیم ادارہ بن چکا ہے۔ اب خود وہ بھی وہی کر رہا ہے جو اس کے ساتھ سو سال پہلے کیا گیا تھا۔ موجودہ ندوہ صرف ان چیزوں کی اہمیت کو جانتا ہے جس پر سو سال کی مدت گزر چکی ہو۔ نیا فکر اور نیا اسلوب موجودہ ندوہ کے لیے اجنبی ہے۔ چنانچہ آج کے کسی جدید کا وہ خود بھی اسی طرح مخالف ہو جاتا ہے جس طرح سو سال پہلے اس کے جدید کی مخالفت کی گئی تھی۔

اس زمانہ میں افتخار اعظمی صاحب حضرت گنج پیلیس کے ایک مکان میں رہا کرتے تھے (۲ اپریل ۱۹۹۴ کو لندن میں ان کا انتقال ہوگیا) غالباً ۱۹۶۵ کی بات ہے انھوں نے یہاں اپنے ایک ہندو دوست سے ملایا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور مذہب میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے مجھ سے کہا: محمد کو اگر تاریخ سے نکال لیا جائے تو تاریخ میں کیا کمی

رہ جائے گی۔ میری زبان سے نکلا کہ وہی کمی جو محمد سے پہلے تاریخ میں تھی۔

مذکورہ تعلیم یافتہ ہندو کے اس سوال نے میرے ذہن میں ایک مستقل ہیجان برپا کر دیا۔ اس کے بعد میں سیرت اور اسلام کا اسی خاص نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے لگا۔ میرے اس مطالعہ کا نتیجہ دو کتابیں تھیں۔ پیغمبر انقلاب (۱۹۸۲) اور اسلام دور جدید کا خالق (۱۹۸۹) مذکورہ ہندو کا سوال بظاہر اشتعال انگیز تھا۔ اگر میں اس کو سن کر بگڑ جاتا تو میرے حصہ میں صرف یہ آتا کہ میں یہ کہتا پھروں کہ ہندو بہت متعصب ہوتے ہیں۔ ہندو اسلام دشمن ہیں، وغیرہ۔ مگر جب میں نے ان کے کلام کو مثبت ذہن کے ساتھ سنا تو وہ میرے لیے ایک طرف دو کتابوں کی تالیف کا سبب بن گیا اور دوسری طرف خود میری ذات کے لیے وہ اضافۂ ایمان کا ذریعہ ثابت ہوا۔

موجودہ صدی میں لکھنؤ مختلف پُرشور تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔ مگر یہ تحریکیں حقائق سے زیادہ جذبات پر مبنی تھیں، چنانچہ تقریباً سب کی سب بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں۔ انھیں میں سے ایک وہ واقعہ ہے جس کو میثاق لکھنؤ (Lucknow Pact) کہا جاتا ہے۔

یہ واقعہ ۱۹۱۶ کا ہے۔ مسلم لیڈروں کو یہ خوف تھا کہ آزاد ہندستان میں ہندو اپنی عددی اکثریت کی بنا پر غالب حیثیت حاصل کر لیں گے۔ اس کے حل کے لیے، ۱۹۴۷ سے پہلے جو تدبیریں سوچی گئیں، ان میں سے ایک "میثاق لکھنؤ" تھا۔ لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کی مشترکہ میٹنگ میں ایک سمجھوتہ ہوا۔ اس کی رو سے مسلمانوں کے مطالبہ کے مطابق، جداگانہ انتخاب کے اصول کو مان لیا گیا۔ اقلیت کے حقوق کی حفاظت کے لیے اس کو اس کی آبادی سے کچھ زیادہ نشستیں دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور اس کو ویٹج سسٹم (weightage system) کہا گیا۔ اس کے مطابق طے پایا کہ آیندہ جو قوانین صوبائی یا مرکزی اسمبلیوں میں پیش کیے جائیں یا جو اصلاحات ملک میں نافذ کی جائیں، اگر کسی فرقہ کے نمایندوں کی تین چوتھائی تعداد ان کے خلاف ہو تو وہ قوانین پاس نہیں کیے جائیں گے اور نہ ایسی اصلاحات کو قبول کیا جائے گا۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کو شکایت ہے کہ کانگریس بعد کو اس معاہدہ سے پھر گئی اور اس طرح اس نے ملک کی تقسیم کے اسباب پیدا کیے۔

مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس لفظی معاہدہ کو کانگرس یا ہندو نے نہیں بلکہ حقائق کے زور نے ختم کیا۔ اسی قسم کا ایک لفظی معاہدہ وہ تھا جو خود پاکستان میں محمد ایوب خاں اور حسین سہروردی نے

مل کر طے کیا تھا۔ اس کے مطابق ، مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) اور مغربی پاکستان کے درمیان برابری (parity) کا اصول مقرر کیا گیا تھا۔ یعنی مشرقی پاکستان کی آبادی اگرچہ پاکستان کی مجموعی آبادی کا ۵۵ فی صد ہے ، مگر اسمبلی میں دونوں حصوں کی نشستیں ۵۰-۵۰ فی صد رہیں گی۔ یہ فیصلہ بھی "میثاق لکھنؤ" کی طرح غیر حقیقی تھا، چنانچہ ۱۹۷۱ کے طوفان میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

اگر میں یہ کہوں کہ میرے نئے تحریری دور کا باضابطہ آغاز لکھنؤ سے ہوا تو یہ غلط نہ ہوگا۔ مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد میں زیادہ تر ادبی مضامین لکھا کرتا تھا۔ کئی سال کے لمبے دور کے بعد مجھے خیال ہوا کہ جدید فکری چیلنج کو مجھے اپنا موضوع بنانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں میں نے جو مطالعہ شروع کیا اس کا پہلا نتیجہ وہ مضمون تھا جو "نئے عہد کے دروازہ پر" کے نام سے پمفلٹ کی صورت میں چھپ چکا ہے۔ اس مقالہ کو ابتداءً میں نے ۲۸ فروری ۱۹۵۵ کو لکھنؤ کے ایک اجتماع میں پیش کیا تھا جو امین آباد میں جماعت اسلامی ہند کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس مقالہ کو پیشگی طور پر غالباً ایک ہزار کی تعداد میں چھپوا لیا گیا تھا۔ جب میں اس کو پڑھ چکا تو اسٹیج کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ یہ مقالہ یہاں اسٹال پر برائے فروخت موجود ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس اعلان کو سن کر لوگ اسٹال پر ٹوٹ پڑے۔ مقالہ ہاٹ کیک کی طرح فروخت ہوا اور اسی وقت اس کی ساری کاپیاں ختم ہو گئیں۔

۲ مارچ ۱۹۹۲ کو لکھنؤ سے واپسی تھی۔ پہلے ہم لوگ الجمعیۃ الخیریہ لمساعدۃ الطلاب (اسٹوڈنٹس اسلامک ویلفیر سوسائٹی) کا دفتر (راجہ جی پورم) دیکھنے کے لیے گئے۔ یہاں کچھ تعلیم یافتہ افراد جمع ہو گئے تھے۔ ان سے دینی اور ملی موضوع پر گفتگو ہوئی۔ تنظیم کے صدر نے اس کے مقاصد اور پروگرام کی مختصر تشریح کی۔ یہ ایک خوبصورت دفتر ہے جو خوبصورت ماحول میں بنایا گیا ہے۔

یہاں سے فراغت کے بعد ایر پورٹ کے لیے روانہ ہوا۔ روانگی میں کسی قدر تاخیر ہو گئی۔ درمیان میں ریلوے کراسنگ پر مزید تاخیر ہوئی۔ ایر پورٹ پہنچا تو کاؤنٹر پر یہ جواب ملا کہ وقت ختم ہو گیا۔ ہم مسافروں کی فہرست تیار کر کے بھیج چکے ہیں اور اب بورڈنگ کارڈ دینے سے معذور ہیں۔ اس کے بعد ہمارے ایک ساتھی جناب نثر جلیل صاحب اندر گئے اور افسر سے کہا۔ اس نے فوراً وائرلیس کے ذریعہ جہاز سے رابطہ قائم کیا۔ وہاں سے جواب

ملا کر بھیج دیجیے۔ چنانچہ انھوں نے مجھ کو بورڈنگ دے دیا اور میں تیزی سے چل کر جہاز کے اندر داخل ہوگیا۔ فلائٹ نمبر ۸۱۶ کے ذریعہ دہلی پہنچا۔

بظاہر خواہ کتنا ہی مایوسی کی صورت حال ہو۔ آدمی کو اپنی امید ختم نہیں کرنا چاہیے اور اپنی کوشش کو جاری رکھنا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ مایوسی کی آخری حد پر پہنچ کر بھی آدمی کے لیے امید کا وسیع دروازہ کھل جائے۔

جہاز کے اندر اعلانات شروع ہوئے: ایک اعلان ہوا تو اس کے الفاظ مجھے اس طرح سنائی دیے:

Captain Islam is in command.

ایک لمحہ کے لیے احساس ہوا کہ "اسلام" نے اچانک ظاہر ہو کر دوبارہ وقت کی زمام کار سنبھال لی ہے۔ مگر جب دوبارہ اعلان ہوا تو معلوم ہوا کہ اناؤنسر نے کیپٹن اسلام نہیں کہا تھا کہ بلکہ کیپٹن اوسوال کہا تھا۔ میں نے سوچا کہ "مسٹر اسلام" کو کمانڈنگ حیثیت میں لانا کوئی اعلان کا معاملہ نہیں، یہ تاریخی عوامل میں انقلابی تبدیلیاں لانے کا معاملہ ہے۔ جب تک تاریخ میں تبدیلی پیدا نہ ہو اس وقت تک قیادت میں تبدیلی پیدا ہونے کا کبھی کوئی امکان نہیں۔

دہلی پہنچ کر شہر کے لیے روانہ ہوا۔ ایک مقام پر لال بتی کی بنا پر گاڑی رکی۔ دیکھا تو سڑک کے کنارے لکھا ہوا تھا —— اسٹاپ لائن کو پار نہ کیجیے:

do not cross stop line.

یہ صرف سڑک کا اصول نہیں بلکہ پوری زندگی کا اصول ہے۔ زندگی کے سفر میں جگہ جگہ "اسٹاپ لائن" ہوتی ہے، اس اسٹاپ لائن پر رکنا ضروری ہے۔ جو آدمی ایسا نہ کرے اس کا انجام تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اُردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمت قرآن	30/-
عظمت اسلام	50/-
عظمت صحابہ	7/-
دین کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہور اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات	50/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسول	25/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	60/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-

مطالعہ سیرت	9/-
ڈائری جلد اول	-
کتاب زندگی	40/-
انوار حکمت	-
اقوال حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	8/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-

حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
نار جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	30/-
تعدد ازواج	3/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دور جدید	8/-
سیرت رسول	
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-
الاسلام یتحدی	85/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے جیون ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	3/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	

God Arises	85/-
Muhammad The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	40/-
God-Oriented Life	60/-
Religion and Science	40/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	12/-
The Teachings of Islam	15/-
The Good Life	12/-
The Garden of Paradise	15/-
The Fire of Hell	15/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	20/-
Polygamy and Islam	3/-
Words of the Prophet	--
Islam the Voice of Human Nature	--
Islam the Creator of Modern Age	--

آڈیو کیسٹ

حقیقت ایمان	25/-
حقیقت نماز	25/-
حقیقت روزہ	25/-
حقیقت زکوٰۃ	25/-
حقیقت حج	25/-
سنت رسول	25/-
میدان عمل	25/-
پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحاد ملت	25/-
تعمیر ملت	25/-
نصیحت لقمان	25/-

ویڈیو کیسٹ

حقیقت روزہ	150/-

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel 4611128, Fax 4697333

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر



AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel : 4611128, 4697333 Fax : 91-11-4697333